املا دونوں طرح ہو مثلاً خاصہ، خاصا خاکہ، خاکا، گاؤں، گانو وغیرہ، ایک زمانہ میں بلا ضرورت انگریزی الفاظ کا استعمال فیشن بن گیا تھا، آجکل بعض اہل قلم متبادل اردو لفظوں کے ہوتے ہوئے بھی خواہ مخواہ ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس کتاب سے اس کی چند مثالیں یہ ہیں: ماتر بھومی کے سچے سپوت، پتی، بر، دیوی، ماتا پتا، سورگ، آدرش وادی، جنتا، اندولن، بھرشٹا چاری، پوتر، شاید انکے استعمال کی وجہ یہ ہو کہ ساہتیہ اکیڈمی اپنا خاص اسلوب پیش کرنا چاہتی ہو، یہ کتاب ہندی سے ترجمہ کی گئی ہے، مجموعی حیثیت سے ترجمہ رواں اور بہتر ہے، لیکن بعض الفاظ اور جملے ہو بہو ہندی اسلوب کا چربہ معلوم ہوتے ہیں، جیسے ہندستانی، پٹھانن، گڑگھنٹے وغیرہ، جناب ل۔ احمد اکبر آبادی اردو کے مشہور اور ممتاز اہل قلم ہیں، معلوم نہیں انھوں نے اس قسم کی زبان اپنے ترجمے میں کیوں روا رکھی، مختصر ہونے کی وجہ سے یہ کتاب اسکول اور کالجوں کے طلبہ کیلئے مفید ہے، اگر بعض تشریح طلب باتوں اور ناموں پر مختصر حاشیے بھی لکھ دیے جاتے تو اس کی قدر و قیمت دو چند ہو جاتی۔

فہرست مخطوطات (جلد اول) مرتبہ مولانا سید محمد متین ہاشمی، مولانا ساجد الرحمن صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۲۴۲، مجلد، قیمت للعہ، ناشر: مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، پاکستان۔

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری (لاہور) نے مخطوطات فراہم کرکے انکی تفصیلی فہرست شائع کرنیکا پروگرام بنایا ہے، یہ اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے، اس میں مصاحف، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، تاریخ، ادب، اور طب وغیرہ مختلف فنون کی عربی و فارسی کتابوں کی فہرست حروف تہجی کے مطابق ہے، مرتبین نے مخطوطات کے سائز، اوراق کی تعداد، نشان خط، کاتبوں اور مصنفوں کے ناموں کی تصریح اور ترقیمہ، آغاز و اختتام کی عبارتوں کو نقل بھی کیا ہے، مخطوطات کی اہم خصوصیات اور مصنفین کے حالات بھی تحریر کیے ہیں، فہرست کے آخر میں کئی انڈکس اور بعض مخطوطات کے عکسی فوٹو بھی ہیں، اگر فہرست کی ترتیب سے محنت ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن مصنفین کے حالات اصل مآخذ کے بجائے ثانوی مآخذ سے لیے گئے ہیں اور مشہور مصنفین کے تذکرے میں خواہ مخواہ طوالت پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کی

ت زیادہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۰ ماہ جمادی الاول ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۷ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

گذشتہ ماہ اتر پردیش کی اردو اکاڈمی کے سالانہ جلسہ کے خطبۂ صدارت میں بیگم حامدہ حبیب اللہ نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اگر اتر پردیش میں اُردو کو علاقائی اور سرکاری زبان کو تسلیم کرنے کے فیصلہ میں وقت درکار ہو تو فوری طور پر کم از کم آٹھویں درجہ تک اردو کی تعلیم سکنڈ فارم کی حیثیت سے ضروری قرار دی جائے، یہ مطالبہ ایسا نہیں ہے جو قابلِ قبول نہ ہو، البتہ اس میں حکومت کی فراخدلی اور رواداری کے ساتھ ع گلستاں میں نسیمِ دل شکن کی آزمائش ہے،

بیگم حامدہ حبیب اللہ اپنی صدارت کے فرائض بہت ہی جمہوری انداز میں انجام دیتی ہیں، جلسہ کی کارروائی میں مفید مشوروں کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتی ہیں، مباحثہ کی فضا کبھی مکدر ہو جاتی ہے تو وہ اپنے تکدر کا اظہار بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کرتی ہیں، انھوں نے اپنے خطبہ میں اس کا اعتراف کیا کہ ناتجربہ کاری میں اکاڈمی سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے، مگر ان کی خواہش ہے کہ اس کی طرف توجہ نیک نیتی سے مبذول کرائی جائے تاکہ اس کا ازالہ ہو، ورنہ ان کا خیال ہے کہ صرف مخالفت کے جذبے میں اعتراضات کی بوچھار سے اردو کا بھلا نہ ہوگا،

ان کی ہم نوائی جناب آنند نرائن ملا بھی کرتے ہیں، جو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ کے صدر ہیں، اردو زبان نے ہندوستان کی جس ملی جلی تہذیب کو سنوارا ہے وہ اس کی پوری نمایندگی کرتے ہیں، وہ اردو زبان کو اپنی شیریں بنا کر اس کے فرہاد بنے ہوئے ہیں، گو ابھی تک ان کو وہ تیشہ ہاتھ نہیں آیا ہے جس سے وہ اپنی شیریں کے لئے جوئے شیر جاری کر سکیں، اکاڈمی کے جلسہ کے بعض ارکان جب کبھی اعتراضات کی بوچھار کرتے ہیں، تو ان کے جواب میں اُن کی بردباری اور شرافت اخلاق کے آبدار موتی جھلملاتے نظر آتے ہیں، وہ ایک لائق جج بھی رہ چکے ہیں، اسلئے اُن کی سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ اردو کی فلاح و بہبود کی ساری سرگرمیاں بے سود ہیں، جب تک کہ ریاست میں اس کو سرکاری

اور علاقائی زبان ہونے کا حق نہیں مل جاتا ہے، اور یہ بالکل صحیح ہے،

اگر اس کو یہ قانونی حق مل جائے، تو اس کی اقتصادی قدریں بھی بڑھ جائیں گی، جب تک طلبہ کو اس کا احساس نہ ہوگا کہ اسکی تعلیم سے ان کی معاشی حالت بھی درست ہو سکتی ہے، وہ اسکو پڑھنے کیلئے تیار نہیں ہونگے، ایسے طلبہ کی تعداد بہت تھوڑی ہوا کرے گی جو اس کو ایک مادری زبان کی حیثیت سے اپنے سینہ سے لگائے رکھنا پسند کرینگے، آنند نرائن ملا صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ اردو زبان کا پانی پت اتر پردیش ہے، یعنی اس ریاست میں اردو کی جنگ جیتی اور ہاری بھی جا سکتی ہے، یہ جنگ لڑنے کے بجائے اکاڈمی کی سرگرمیاں احتساب اور محاسبہ کے دور سے گذر رہی ہیں،

اس کے سکریٹری جناب صباح الدین عمر صاحب کو ان کی محنت اور تندہی کی داد ضرور ملتی ہے، مگر اکاڈمی کے جنرل کانسل کے جلسہ میں اُن کی نگاہیں ارکان کو دیکھ کر زبان حال سے کہتی رہتی ہیں کہ اُن کے لئے وہی گھڑیاں سخت گزرتی ہیں، ع :- اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد،

ان سے جو بعض سوالات کئے جاتے ہیں اُن کے صحیح ہونے میں تو اُن کو بھی شک نہیں ہوتا مگر کچھ اعتراضات کے انداز تخاطب اور شیوہ تکلم میں ایسے بھی لمحات آ جاتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے یہ خیال آتا رہتا ہے کہ اکاڈمی کے چیدہ دل و دماغ کا بہت ہی شائستہ مجمع ہے،

اکاڈمی اپنی مختلف سرگرمیوں میں پہلے سے بہت زیادہ ترقی کر گئی ہے، اس کا سالانہ بجٹ سترہ لاکھ ۱۷،۰۰۰۰۰ تک پہنچ چکا ہے، مگر جب تک اردو کو اس ریاست میں سرکاری زبان کا درجہ نہیں ملتا، یہ سترہ لاکھ کا سالانہ بجٹ اردو کا ایک اچھا خونبہا ہے، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست اور پریم چند کی زبان کیلئے جب دار و رسن کا سامان ہو چکا، سرسید، شبلی، نذیر، اور مہدی افادی کے اسلوب بیان کی سادگی، رعنائی اور دلآویزی کی تدفین کی تیاری ہو چکی، حسرت نے پرچھائیوں کو جو آب و رنگ دیا تھا، جگر کی شاعری میں عشق کی بندگی اور بے چارگی حسن کی تمام جابرانہ استبدادیت پر طنز کے ساتھ جو مسکراتی نظر آتی تھی، فانی نے غم کی روح پگھلا کر اس سے آگ کا کام لینے والی جو تاثیر پیدا کی تھی ان سب کو بھلا دینے کی مہم پوری ہو چکی، تو اردو کو صرف کفن پہنانے کی ضرورت تھی، حکومت نے اس کو ناتواں پا کر اس کو ہلکا کفن پہنانے میں اپنے آنچل کا سایہ اردو اکاڈمی کی صورت میں دیدیا، جو ارزد

ناخ کو اپنے معشوق کے ذریعہ سے پوری نہیں ہوئی تھی، وہ اُن کی اضطراب زدہ، جفا دیدہ اور اجل رسیدہ زبان اردو کے ذریعہ سے پوری ہوتی نظر آئی، ناسخ نے اسی سرزمین میں اردو ے معلیٰ کو اردوے معلا بنا کر ایک مرمریں محل میں بٹھا دیا تھا، مگر وہ آج وہیں غریب الوطن ہے، اس کو کہیں گھنی چھاؤں نہیں مل رہی ہے،

———— . ————

اگر حکومت اردو اکاڈمی کو اپنی امداد بند کر دے، اس کی طرف سے مصنفوں کو انعامات بھی نہ ملیں، طلبہ اور طالبات اس کے وظائف سے بھی محروم ہو جائیں، نادار بیمار مصنفوں کو علاج کے لئے مالی سہولتیں بھی نہ دیجائیں، اکاڈمی کے لئے عمارت بھی نہ بنے، تو اردو بولنے والوں کو کوئی شکایت نہ ہوگی اگر اردو ریاست کی ایک سرکاری اور علاقائی زبان تسلیم کر لی جائے، مگر حکومت اردو کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہے، وہ اس کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لئے آمادہ نہیں، یہ شاید اس لئے بھی کہ اردو بولنے والوں میں اس کو آمادہ کرنے کا دم خم بھی نہیں، اس کے بعد اردو اکاڈمی کی حیثیت بس یہ ہو کہ

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک گلی بہاراں کی ۔۔۔۔ بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

جب اپنی بے بسی اور مجبوری میں گریباں کی دھجی ہی غنیمت ہو تو ہوش مندی سے اکاڈمی کو فعال اور متحرک بنانے ہی میں مصلحت ہے، جو شاید یہ کہ مگر حکومت پر اثر انداز ہو کہ ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا، بدلے ہوئے حالات میں حکومت میں عز اخدلی اور اپنے شہریوں کی دلنوازی اور دلجوئی کا جو جذبہ پیدا ہو رہا ہے اس بنا پر کیا عجب ہے کہ اردو بولنے والوں کو وہ قانونی حق مل جائے، جو وہ اپنی کوتاہیوں اور مجبوریوں سے خود نہیں منوا سکتے،

———— : ————

ان سطروں کے لکھتے وقت خبر ملی کہ بہار میں اردو زبان وہاں علاقائی اور سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی، جہاں اس کے بولنے والے پندرہ فی صدی ہیں بہار کی اس سبقت سے آتش، انیس، دبیر، اکبر الہ آبادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہم وطنوں کو یہ پیام ملا ہے کہ وہ اپنی گراں خوابی کو چھوڑ کر اپنی جگہ تابی کا ثبوت دیں، ورنہ ان پر یہ الزام رہے گا،

ع :- عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے

......ہ......

مقالات

اسلام میں مذہبی رواداری

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۴)

ایک حج کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے تمام عاملوں کو طلب کیا، جب انکے ساتھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے تو ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "لوگو! میں نے ان عمال کو تمھاری نگرانی کے لیے بھیجا ہے، ان کو اس لیے نہیں مقرر کیا ہے کہ تمھارے مال، جان، عزت اور آبرو پر دست درازیاں کریں، اگر تم میں سے کسی پر ظلم ہوا ہو تو وہ کھڑا ہو جائے، پورے مجمع میں سے صرف ایک آدمی کھڑا ہو کر بولا امیر المومنین! آپکے ایک عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں، حضرت عمرؓ نے اس آدمی کو حکم دیا کہ وہ بھی ان کے سامنے عامل کو سو کوڑے مارے، یہ سن کر حضرت عمروؓ بن العاص اٹھے اور بولے، امیر المومنین! اگر ایسا کیا گیا تو یہ روایت بن جائے گی، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس شخص کو اس عامل سے قصاص نہ دلواؤں، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سے قصاص لیتے دیکھا، حضرت عمروؓ بن العاص نے بیچ بچاؤ کر کے مستغیث کو ایک ایک تازیانہ کے بجائے دو دو اشرفیاں دے کر راضی کیا۔ (کتاب الخراج باب ۱۲، فصل ۱)

حضرت عمرؓ کو معلوم ہو جاتا کہ کوئی عامل اپنے نمود و ترفع کا اظہار کرتا ہے، بیمار کی عیادت نہیں کرتا ہے، مگر وہ اس کے دربار میں پہنچ نہیں پاتے ہیں تو اس کو معزول کر دیتے، انھوں نے اپنے عاملوں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ وہ ترکی گھوڑے پر نہ سوار ہوں، باریک کپڑے نہ پہنیں، چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں، دروازہ پر دربان نہ رکھیں، اہل حاجت کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھیں، اگر کوئی ان ہدایتوں کی خلاف ورزی کرتا تو اس کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کرتے، اس کے لیے جو سزا تجویز کرتے تو اس کی تعمیل ضرور ہوتی، ان کی ان سختیوں کی وجہ سے انکا نظام مملکت ایسا اعلیٰ اور عمدہ رہا کہ آج وہ دنیا کے بہترین حکمرانوں میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کی کامرانی کا راز یہ تھا کہ ان کا دل خدا کے بارہ میں نرم ہوتا تو جھاگ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتا، سخت ہوتا تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا۔

ان کو اپنی مملکت میں کسی باغیانہ سازش کی خبر مل جاتی تو اس کو فرو کرنے میں بھی پوری سختی سے کام لیتے، یہ سازش اگر غیر مسلموں کی ہوتی تو ان کو سزا دینے میں تامل تو نہیں کرتے لیکن اس میں بھی ان کی رحمدلی، لینت اور رواداری بروئے کار آجاتی، شام فتح ہوا تو اس کی آخری سرحد پر ایک شہر عربسوس تھا، یہاں کے لوگوں سے معاہدہ ہو گیا، مگر وہ چپکے چپکے ایشیائے کوچک کے رومیوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کے راز ان کو بتاتے تھے، حضرت عمرؓ کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہاں کے حاکم عمیرؓ بن سعد کو لکھ بھیجا کہ ان کو ایک برس کی مہلت دو کہ وہ اپنی سازش سے باز آئیں، اور اگر باز نہ آئیں تو ان کی جائداد، زمین، مویشی اور اسباب کو شمار کر کے ایک ایک چیز کی دو چند قیمت دیدو اور ان سے کہو کہ کہیں اور چلے جائیں، اس حکم کی تعمیل کی گئی،

(بلاذری اردو ترجمہ ص ۲۵۵، عربی ص ۱۵۷، الفاروق جلد دوم ص ۴۶-۱۴۵)

نجران کے عیسائیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا تھا، پہلے ذکر آچکا ہے کہ

اس کی توثیق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کی لیکن عہد فاروقی میں پتہ چلا کہ وہ باہر کے لوگوں سے ساز باز کر کے اپنے پاس اسلحہ جمع کر رہے ہیں، حضرت عمرؓ کو اندازہ ہو گیا کہ اب وہ مسلمانوں کیلئے خطرہ بنکر نقصان پہنچائیں گے۔ اس لیے ان کو نجران یمن سے نکل کر نجران عراق میں چلے جانے کا حکم دیا، لیکن اس جلاوطنی کے وقت یہ فرمان جاری کیا کہ نجران یمن چھوڑتے وقت وہ اللہ کی امان میں رہیں گے، کوئی مسلمان ان کو نقصان نہ پہنچائے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معاہدہ کر کے ان کو امان دیا تھا، اس کی توثیق حضرت ابوبکرؓ نے بھی کی تھی، شام اور عراق کے امیران کو کھیتی کرنے میں مدد کریں، وہ راہ خدا میں ان کو صدقہ بھی دیں، ان سے کسی طرح کا تاوان نہ لیا جائے، ان پر ظلم کرنے والوں کے خلاف کارروائی کیجائے، ان پر جو جزیہ عائد کیا گیا ہے وہ ان کے پہنچنے کے بعد سے دو سال تک معاف کر دیا جائے، ان پر کوئی زیادتی اور دست درازی نہ کیجائے (کتاب الخراج، باب ۹، فصل ۱)

خیبر کے یہودیوں نے ایسی باغیانہ روش اختیار کی کہ نہ صرف مسلمانوں کے معاملات میں خیانت کی اور ان میں تباہی پھیلانی چاہی بلکہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبداللہؓ کو بالاخانہ سے نیچے پھینک دیا، جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے، حضرت عمرؓ نے ان کو خیبر سے جلاوطن کیا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان سے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ وہ نصف زمین اور نصف پیداوار کے حصہ دار ہوں گے، اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کرتے وقت نصف زمین اور نصف پیداوار کے معاوضے میں سونے چاندی اور اونٹوں کے پالان دیے (فتوح البلدان عربی ص ۳۲، ۲۵، اردو جزء اول ص ۴۹، ۳۸)

فدک کے یہودیوں نے بھی سیاسی بغاوت کی، تو حضرت عمرؓ نے ان کو بھی جلاوطن کیا، مگر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی زمین اور اپنے نخلستان کے نصف حصہ پر مصالحت

کی تھی، اس لیے حضرت عمرؓ نے ان کو جلا وطن کرتے وقت نخلستان اور آراضی میں ان کا جتنا حصہ ہوتا تھا۔ اس کی عادلانہ قیمت تجویز کرنے کے لیے چند واقف کاروں کو بھیجا اور انھوں نے جو تجویز کی اس کے مطابق قیمت ادا کر دی گئی (فتوح البلدان جزو اول، اردو ص ۹۴، عربی ص ۳۰)

ایک بار قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک عیسائی کو ہلاک کر دیا، حضرت عمرؓ کو اس کی خبر ہوئی تو حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کیا جائے، اس حکم کی تعمیل ہوئی، قاتل حنین نامی کو مقتول کے وارثوں نے قتل کر ڈالا (الدرایہ فی تخریج الہدایہ ص ۲۹۰، الفاروق ج ۲ ص ۱۳۸)

ایک بار حضرت عمرؓ بیٹھے حضرت علیؓ سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی آیا اور بولا کہ وہ (حضرت) علی پر دعویٰ کرنے آیا ہے، امیر المومنین حضرت عمرؓ نے یہ سنکر حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا، ابو الحسن سامنے کھڑے ہو کر جواب دو، حضرت علیؓ اٹھے تو انکے چہرہ پر بل تھا، دعویٰ سنا گیا، مدعی جھوٹا ثابت ہوا، وہ چلا گیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا، جب ان کو کھڑے ہو کر جواب دینے کو کہا گیا تو وہ چیں بجبیں تھے، کیا وہ یہودی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دینا پسند نہیں کرتے تھے، حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ یہودی کے برابر کھڑے ہونے میں چیں بجبیں ہونے کا سوال نہ تھا، مگر جب ان کو ابو الحسن کہہ کر کھڑے ہونے کو کہا گیا تو کنیت سے پکارنا نشان عزت ہے، خیال ہوا کہ کہیں یہودی یہ نہ سمجھے کہ عدالت کو مدعا علیہ کا خاص لحاظ ہے، اسی لیے مدعی کے مقابلہ میں عزت کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے، اگر وہ ایسا سمجھ لیتا تو ہماری عدالت پر دھبہ لگتا (رحمۃ للعالمین، جلد سوم، از قاضی محمد سلیمان منصور پوری ص ۱۵۴)

حضرت عمرؓ کا ایک غلام عیسائی تھا، اس کو وہ اسلام قبول کرنے کی ترغیب تو دیتے، مگر

اس پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا، فرماتے کہ مذہب میں زبردستی نہیں، غلام ان کی زندگی میں عیسائی ہی رہا، (کنز العمال بحوالہ طبقات ابن سعد جلد پنجم ص ۴۹، الفاروق ج ۲ ص ۱۴۳)

حضرت عمرؓ نے اپنے عمال اور لشکریوں میں اسلام کی سچی تعلیمات کی ایسی روح پھونک دی تھی کہ ان کے خوف خدا، اتباع سنت، تقویٰ، زہد، تواضع، خدمت گذاری خلق، مہمان نوازی، راستبازی، عدل، ترحم، مساوات، مخالفین سے حسن سلوک سے متاثر ہو کر مفتوحہ ممالک کے غیر مسلم خود بخود اسلام قبول کرتے چلے گئے، شام میں اسلامی لشکر پہنچا تو رومیوں کے سفیر جارج نے اسلام قبول کر لیا۔ (طبری ص ۲۰۹۸)، مصر کے شہر شطا، کا رئیس دو ہزار آدمیوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوا (مقریزی ج ۱ ص ۲۲۶)، دمشق میں وہاں کا بشپ حضرت خالد بن ولیدؓ کے سامنے آ کر مسلمان ہوا (معجم البلدان ج ۷، ص ۱۷۳)، جلولہ کی فتح کے بعد یہاں کے امرا اور رؤسا خود اسلام لے آئے (فتوح البلدان عربی ص ۲۷۴، اردو جلد اول ص ۵۸۴)، قادسیہ کے معرکہ کے بعد ایران کا شاہی رسالہ چار ہزار لشکریوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا (فتوح البلدان عربی ص ۲۸۹، اردو جلد اول ص ۴۸۴، ۴۸۲)، یزدگرد کے بعض فوجی افسر مسلمان ہوئے تو سیابجہ، زط اور اندغار جیسی قومیں بھی اسلام لے آئیں (فتوح البلدان ص ۳۸۲، اردو ج ۲ ص ۹۷) مصر کے بعض قصبے کے لوگ بھی مسلمان ہوئے (مقریزی ج اول ص ۱۶۲) دمیاط کی فتح کے بعد بقارہ سے لیکر عسقلان تک پوری آبادی مسلمان ہو گئی (مقریزی ج ۱ ص ۱۸۴، نیز دیکھو تاریخ اسلام ج ۱ ص ۲۱۹ از شاہ معین الدین احمد ندوی) اور پھر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عراق، شام، مصر اور ایران کے سارے علاقے کی آبادی رفتہ رفتہ اسلام اس طرح قبول کرتی گئی کہ ان میں مسلمانوں کی اکثریت بڑھتی گئی اور وہ اسلامی ممالک کہلانے لگے، یہاں مسلمان اپنے روادارانہ کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش نہ کرتے تو ان کا اسلام کی طرف مائل ہونا کیسے

ممکن تھا، تھوڑے سے لوگوں پر تو جبر اور دباؤ ڈالا جا سکتا، مگر پورے علاقے کو زور اور جبر و دستی سے کسی مذہب کی طرف مائل کرنا انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے،

حضرت عثمان ذی النورینؓ کی رواداری

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غیر مسلموں کے ساتھ جتنے معاہدے ہوئے تھے، وہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں برقرار رہے، اور جو نئے علاقے فتح ہوتے گئے وہاں بھی وہی روادارانہ اسپرٹ باقی رہی، جس کی تعلیم رسول اللہؐ نے دی تھی، وہ تو اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل میں اپنے محبوب آقاؐ کی اتباع کرتے رہتے، ان کا عہد بعض اسباب کی بنا پر پر آشوب رہا، پھر بھی اسلام کے لشکریوں کی جانبازی سے طرابلس، الجزائر، قبرس، طبرستان، آرمینیہ وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے، ان کے زمانہ میں بغاوتیں بھی بہت ہوتی رہیں، ان کی طبیعت میں لینت، نرمی اور مروت بہت تھی، مگر ان بغاوتوں کو تشدد و تلطف کی حکمت عملی سے فرو کرتے رہے، مفتوحہ ممالک کی خوشحالی اور بدحالی سے باخبر رہنے کے لیے جلیل القدر صحابیوں کے وفود وہاں بھیجا کرتے جمعہ کے دن منبر پر پہنچکر اطراف ملک کی خبریں پوچھتے، اور عام اعلان کر رکھا تھا، جس کسی کو کسی والی سے شکایت ہو، وہ حج کے موقع پر آکر بیان کرے، اس موقع پر تمام عمال کو بھی لازمی طور پر طلب کر لیتے، تاکہ شکایتوں کی تحقیقات آسانی سے ہو سکے (طبری ص ۲۹۴۳، مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۷۳)

ان کے زمانہ میں نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں نے کچھ زیادتیاں کیں تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کی، اس وقت وہاں کے حاکم ولید بن عتبہ تھے، حضرت عثمانؓ نے ان کو لکھ بھیجا کہ عراق میں نجران کے جو باشندے ہیں، ان کے اسقف عاقب اور سردار نے میرے پاس آکر شکایت کی ہے، اور مجھے وہ شرط دکھائی ہے جو عمرؓ نے انکے ساتھ طے کی تھی، مجھے معلوم ہوا کہ مسلمانوں سے ان لوگوں کو کیا نقصانات پہنچے ہیں، میں نے انکے جزیہ میں سے تیس جوڑوں کی تخفیف کر دی، انھیں میں نے اللہ جل شانہ کی راہ میں بخش دیا ہے،

اور میں نے ان کو وہ ساری زمین دیدی جو عمرؓ نے ان کو یمنی زمین کے عوض صدقہ کی تھی، اب تم ان کے ساتھ بھلائی کرو کیونکہ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں ذمہ حاصل ہے، میرے اور ان کے تعلقات بھی اچھے رہے ہیں، عمرؓ نے ان کے لیے جو صحیفہ تحریر کیا تھا اس کو غور سے دیکھ لو اور اس میں جو کچھ درج ہے، وہ پورا کرو، (کتاب الخراج اردو ترجمہ ص ۲۷۶)

ان کی خواہش رہی کہ ان کے محبوب آقاؐ کی تعلیمات کی تبلیغ زیادہ سے زیادہ ہوتی رہے، مگر ان کا خود طریقہ یہ رہا کہ جو قیدی گرفتار ہو کر ان کی خدمت میں پیش کیے جاتے تو ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کے بجائے دین متین کے صرف محاسن بیان کرتے، ایک بار بہت سی رومی لونڈیاں گرفتار ہو کر آئیں، معمول کے مطابق ان کے پاس جاکر اسلام کی خوبیاں ان کو بتائیں، ان میں سے صرف دو لونڈیوں نے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا، بقیہ اپنے حال پر قائم رہیں (خلفائے راشدین از حاجی معین الدین ندوی ص ۲۴۶ بحوالہ ادب المفرد باب خفض المرأۃ

حضرت علیؓ کی مذہبی رواداری

حضرت علی مرتضیٰؓ رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت بھی زیادہ تر پر آشوب پرشور رہا، ان کے خلافت کی مدت پانچ سال رہی، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے قصاص کے جھگڑے، خارجیوں اور سبائیوں کی فتنہ انگیزیوں کے خلاف جنگ، امیر معاویہؓ سے اختلاف اور لیلۃ الحریر کی لڑائیوں، عجم، کرمان اور فارس میں بغاوتوں کی بدولت ان کو وہ سکون حاصل نہ ہو سکا جو حکمرانی کے لیے ضروری ہے، مگر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ میں تربیت پائی تھی، اس لیے زہد، تقویٰ، عبادت، تواضع، انفاق فی سبیل اللہ، حسن سلوک میں جو اعلیٰ نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں وہ ان کی زندگی میں ملتے ہیں، شجاعت میں کوئی معاصر آپ کا حریف نہ تھا، مگر وہ برابر رسول اللہؐ کی

اس حدیث پر عمل فرماتے رہے کہ بہادر وہ نہیں ہے جو دشمن کو پچھاڑ دے بلکہ وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے، ان کی زندگی کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک لڑائی میں ایک یہودی کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر سوار ہو گئے اور اس کو ہلاک کرنا چاہتے تھے کہ اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا، تو یکایک اس کے سینہ پر سے اتر کر علیحدہ ہو گئے، یہودی نے متعجب ہو کر اس طرح علیحدہ ہونے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ پہلے تم کو خدا کی خاطر ہلاک کرنا چاہتا تھا، تم نے میرے منہ پر تھوکا تو اب میں تم کو ہلاک کرتا تو اپنے نفس کی خاطر کرتا جو صحیح نہیں ہوتا، یہ سنکر یہودی مسلمان ہو گیا،

وہ اپنے حسن سلوک کی وجہ سے بیحد مقبول رہے، ان کے اسی وصف پر بھروسہ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اشاعت اسلام کا کام برابر لیتے رہے، فتح مکہ کے بعد حضرت خالدؓ ابن ولید بنو خذیمہ میں تبلیغ اسلام کے لیے مامور ہوئے، اس قبیلہ نے پہلے تو اسلام قبول کر لیا، پھر منحرف ہو گئے، حضرت خالدؓ نے ان میں سے کچھ لوگوں کو قید اور کچھ کو قتل کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا تو آپ کو دکھ ہوا، آپ کو حضرت علیؓ کے حسن معاملہ کی کارکردگی پر پورا اعتماد تھا، اس لیے آپ نے اس غلطی کی تلافی کے لیے بنی خذیمہ کے پاس بھیجا، حضرت علیؓ نے رواداری سے کام لیا، قیدیوں کو رہا کر دیا اور مقتولین کے وارثوں کو خونبہا دیا (فتح الباری ج ۸ ص ۴۴)، اسی طرح حضرت خالدؓ یمن تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تو وہ وہاں بھی ناکام رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہاں کے لیے حضرت علیؓ کا انتخاب کیا، حضرت علیؓ پہلے تو اس کام کو دشوار سمجھے، مگر آپ نے ان کے سینہ پر دست مبارک رکھکر دعا فرمائی کہ اے خدا اس کی زبان کو راست گو بنا، اور اس کے دل کو ہدایت کے نور سے منور کر دے،" اس کے بعد ان کے سر پر عمامہ باندھا اور سیاہ علم دے کر یمن کی طرف روانہ کیا، حضرت علیؓ نے

اپنے حسن تدبیر اور حسن سلوک سے وہاں کا رنگ کچھ ایسا بدل دیا کہ ہمدان کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا (فتح الباری ج ۸ ص ۵۲، خلفائے راشدین ص ۸۳-۲۸۲)

خارجی حضرت علیؓ کے خلاف برابر سازش کرتے رہے، وہ مجوسیوں، مرتدوں، نومسلموں اور ذمیوں کو بغاوت پر آمادہ کرتے رہتے، مگر حضرت علیؓ نے ان کی بغاوتوں کو بڑے صبر و تحمل سے فرو کیا اور جب وہ زیر ہو جاتے تو ان سے لطف و ترحم کا برتاؤ کرتے، ایرانی باغی ان کے فیاضانہ سلوک سے یہ کہہ اٹھے تھے کہ امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب کے طریق جہانبانی نے تو نوشیروانی طرز حکومت کی یاد بھلادی،

وہ مسلمانوں کی مذہبی بے اعتدالیوں کو گوارا نہیں فرماتے، سبائی ان کو خدا کہنے لگے تو فرمایا کہ ان کو سزا دینا بھی مذہب کی بڑی خدمت ہے، خدا کی وحدانیت کے غلبہ میں کچھ زندیقوں کو انھوں نے زندہ جلا دینے کی سزا دی، مگر جب حضرت ابن عباسؓ نے ان کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سزا کی ممانعت فرمائی ہے، تو اس سے ندامت کا اظہار فرمایا (کتاب الخراج ص ۹۹)، مگر ذمیوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت و محبت کا برتاؤ رکھا، حضرت عمرؓ نے ان سے جتنے معاہدے کیے تھے ان کو برقرار رکھا، حضرت عمرؓ نے حجاز کے عیسائیوں کو نجران یمن سے جلاوطن کر کے نجران عراق میں آباد کرا دیا تھا، کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف گھوڑے اور اسلحہ جمع کرنے شروع کر دیے تھے، حضرت علیؓ کے زمانہ میں وہ واپس آنا چاہتے تھے، اور جب حضرت علیؓ سے اس کے لیے درخواست کی تو انھوں نے منظور کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ عمرؓ کے فیصلے بہت موزوں ہوتے تھے، پھر بھی ان کے لیے یہ تحریر لکھ دی کہ تم لوگ میرے پاس اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر لیکر آئے ہو جس میں تمھارے، لیے تمھاری جان، تمھارے مال کے سلسلے میں شرط لکھی ہے، تمھارے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکرؓ اور

عمرؓ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ میں نے پورا کر دیا، لہذا اب جو مسلمان ان کے یہاں جائے اسے ان وعدوں کو پورا کرنا چاہیئے جو ان کے ساتھ کئے گئے ہیں، نہ ان کو دبایا جائے، نہ ان کے ساتھ ظلم کیا جائے، نہ ان کے حقوق میں سے کسی قسم کی کمی کیجائے۔ (کتاب الخراج ص ۲۷۷-۲۷۸، اردو ترجمہ)

حضرت علیؓ ذمیوں کے حقوق کی پامالی کسی حال میں گوارا نہیں کرتے۔ ان کے ایک عامل عمرو بن مسلمہ کی درشتی اور سخت مزاجی کی شکایت ذمیوں نے کی تو حضرت علیؓ نے ان کو لکھ بھیجا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے علاقے کے ذمی دہقانوں کو تمھاری درشت مزاجی کی شکایت ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے، تم کو نرمی اور سختی دونوں سے کام لینا چاہیئے، لیکن سختی ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے اور نرمی نقصان کی حد تک نہ ہو۔ ان پر جو مطالبہ واجب ہے، اس کو وصول کیا کرو، لیکن ان کے خون سے اپنا دامن محفوظ رکھو۔" اسی طرح ذمیوں کی آبپاشی کی ایک نہر پٹ گئی تھی تو وہاں کے عامل قرظہ بن کعب کو حضرت علیؓ نے لکھ بھیجا کہ اس نہر کو آباد کرنا مسلمانوں کا فرض ہے۔ میری عمر کی قسم مجھے اس کا آباد رہنا زیادہ پسند ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہاں کے لوگ ملک سے نکل جائیں یا عاجز و درماندہ رہ کر ملک کی بھلائی میں حصہ لینے کے قابل نہ رہیں (یعقوبی ج ۲ ص ۲۳۹-۲۴۰ و تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی جلد اول ص ۳۶۸)

ایک مرتبہ حضرت علیؓ کی زرہ کہیں گر پڑی، اس کو ایک نصرانی نے اٹھا لیا، انھوں نے اس کو دیکھ کر پہچان لیا، نصرانی نے زرہ دینے سے انکار کر دیا، حضرت علیؓ نے خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود قاضی شریح کی عدالت میں دعویٰ کیا، قاضی نے انسے پوچھا کہ آپ کے پاس آپ کی اس زرہ ہونے کا ثبوت ہے؟ وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے، تو قاضی شریح نے نصرانی کے حق میں فیصلہ کر دیا، جس سے وہ متاثر ہو کر بولا کہ

یہ تو انبیاءؑ کے جیسا انصاف ہے، امیر المومنین مجھکو اپنی عدالت کے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور قاضی ان کے خلاف فیصلہ دیتا ہے، اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا (ابن اثیر ج ۳ ص ۱۹۰، تاریخ اسلام جلد اول ص ۳۶۹)

حضرت علیؓ جب کوئی فوجی دستہ کہیں روانہ کرتے تو اس کو مخاطب کر کے فرماتے:

"میں تم کو اس اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں جس سے تمھیں لامحالہ ملنا ہے، اس کے علاوہ تمھاری منزل کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ وہی دنیا اور آخرت کا مالک ہے، دیکھو! جس مہم پر تم روانہ کیے جا رہے ہو اس کا پورا اہتمام کرنا اور ایسے کام کرنا جو تمھیں اللہ عزوجل سے قریب کریں، کیونکہ دنیا کی وہی چیز کام آئے گی جو اللہ کے پاس پہنچ گئی۔" (کتاب الخراج فصل ۲، اردو ترجمہ ص ۱۳۷)

حضرت علیؓ کے فیاضانہ سلوک کی اعلیٰ ترین مثال وہ ہے جب ان کا قاتل ابن ملجم ان کے بستر مرگ کے پاس لایا گیا، اسکو دیکھکر فرمایا اس کو اچھا کھانا کھلاؤ، اس کو نرم بستر پر سلاؤ، اگر میں زندہ بچ گیا تو اس کو معاف کرنے یا قصاص لینے کا اختیار مجھے حاصل ہوگا، اور اگر میں مرگیا تو خدا کے سامنے اس سے جھگڑ لوں گا، پھر یہ بھی وصیت کی کہ اس سے قصاص معمولی طور پر لیا جائے، یعنی اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ نہ کاٹے جائیں۔

(طبقات تذکرہ علیؓ بن ابی طالب، تاریخ اسلام جلد اول ص ۳۶۲)

اصلی اسلامی تعلیمات اسلام کی تعلیمات وہی ہیں جو قرآن مجید اور حدیث شریف میں ہیں، یا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ یا خلفائے راشدین کے حالات کے سلسلہ میں پائی جاتی ہیں، اس دور میں کوئی ایسی مثال نہیں ملے گی جس سے اسلام کی تبلیغ میں زور، جبر، زبردستی یا تشدد استعمال ہوا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے کہ دین کے بارے میں

کسی قسم کا جبر نہیں، اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (یونس - ۱۰)

اگر تیرا پروردگار چاہتا (کہ لوگوں کو مومن بنادے) تو زمین کے سب لوگ ایمان لاتے، توکیا اے پیغمبر لوگوں پر زبردستی کریگا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

آپ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بھی حکم ملا تھا۔ جنگ کے بعد جو لوگ پُر امن طریقہ سے رہنا چاہتے ہوں تو ان پر مذہب کے معاملہ میں کوئی زور اور دباؤ نہ ڈالا جائے، ان کے خلاف کوئی مذہبی جنگ بھی نہ کی جائے۔

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (نساء - ۱۲)

تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں، پھر نہ لڑیں اور تمھارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی،

آپ نے تو اپنے کسی قیدی پر بھی اسلام لانے پر جبر نہیں ڈالا، آپ قیدیوں کو کلام پاک سناتے، اسلام لانے کی تلقین کرتے، اگر وہ اسلام نہ لاتے تو ان کو امن کی جگہ پہنچا دیتے۔ کلام پاک میں لڑائی کے میدان میں بھی دشمنوں سے رواداری کی تلقین کی گئی ہے

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ

اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسکو پناہ دے یہانتک کہ وہ خدا کا کلام

مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ (توبہ - ۱۰)

سن لے، پھر اسکو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے، یہ اسلیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں،

اس کا ذکر پہلے آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو خیبر کی مہم پر بھیج رہے تھے تو حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ کیا یہود کو لڑکر مسلمان بنالیں، ارشاد ہوا کہ نرمی سے ان کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمھاری ہدایت سے اسلام لے آئے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے، اس کا بھی ذکر آچکا ہے کہ حضرت عمرؓ کا ایک غلام عیسائی تھا، اس کو چاہتے تو اپنی تلوار کے ذریعہ سے مسلمان بنا سکتے تھے، مگر انکی زندگی کے آخر وقت تک عیسائی رہا، ناظرین کی نظر سے انہی اوراق میں یہ بھی گذر چکا ہے کہ جو غیر مسلم قیدی آتے تو حضرت عثمانؓ انکو دین کے محاسن بتاتے مگر ان پر اسلام قبول کرنے کا جبر یا دباؤ نہ ڈالتے، رومی لونڈیاں ان کے پاس حاضر ہوئیں تو ان کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا، ان میں سے دو لونڈیوں نے تو اسلام قبول کرلیا، بقیہ اپنے پرانے مذہب پر قائم رہیں، گذشتہ اوراق سے یہ بھی ظاہر ہوگا کہ عہد رسالت سے لیکر مرتضوی دور تک عیسائیوں اور یہودیوں سے جتنے معاہدے ہوئے ان میں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں، خانقاہوں، زیارت گاہوں، راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کو ہر طرح محفوظ رہنے کی پوری ضمانت دی گئی، اگر اس کی خلاف ورزی ہوتی تو عاملوں سے باز پرس ہوتی،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے فرمایا ہے

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران - ۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے لائے گئے ہو۔

خیر الامت کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان دنیا میں اس لیے ہیں کہ وہ یہاں خیر بن کر نیکیاں

پھیلائیں، برائیوں سے پرہیز کریں، جب ان کو خیر امت ہونے کی بشارت دی گئی ہے تو تبلیغ کے سلسلہ میں ان کو ظالم اور سفاک بننے کی تعلیم کیسے دیجا سکتی تھی کوئی مسلمان حکمراں یا فاتح ایسا ہوا تو وہ اپنی بشری کمزوریوں نہ کہ اپنی مذہبی تعلیم کی بنا پر ہوا، اسلام کا تو یہ پیام ہے

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ	برائی کی مدافعت خوبی کے ساتھ
فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ	کرو، پھر تو تمھاری عداوت والا
عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ	بھی تمہارا گرم جوش دوست
(حٰم السجدہ - ع ۵)	بن جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی پر عمل کیا، برائی کی مدافعت نیکی سے کی، ظلم کا جواب صبر کرکے دیا تو آپ کے عدو آپ کے گرم جوش دوست بن گئے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کی طرف سے خیر اور نیکی کی تبلیغ شروع کی گئی تو اسی کے خلاف تلواریں اٹھیں، اور اس کی طرف سے جو مدافعت ہوئی، وہ انسانی تاریخ کا بے مثال نمونہ ہے۔

تبلیغ اسلام کی نوعیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت ملی تو پہلے گھر ہی سے اسکی تبلیغ شروع ہوئی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا تھا،

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ	اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں
وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِمَنِ	کو (خدا سے ڈرا) اور اپنی پیروی کرنیوالے
اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاِنْ	مومنین کے لیے نرم ہوجا، اگر تمھاری بات
عَصَوْکَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا	نہ مانیں تو کہدو کہ میں تمھارے اعمال
تَعْمَلُوْنَ (شعراء - ع ۱۱)	سے بری ہوں۔

حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے ایمان لائیں، پھر حضرت علیؓ کو یہ شرف حاصل ہوا جن کی عمر اس وقت دس سال کی تھی، آپ کے غلام زید بن حارثؓ بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے، قریش کے سرداروں میں پہلے حضرت ابوبکرؓ آپ کے گرویدہ ہوئے، حضرت بلال حبشیؓ اور خالد بن سعید ابن وقاصؓ نے بھی آپ کی دعوت کو قبول کیا، عورتوں میں حضرت خدیجہؓ کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کی بیوی ام الفضلؓ، اسماء بنت عمیسؓ، اسماء بنت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی بہن حضرت فاطمہؓ بھی اس چھوٹے سے کارواں میں شریک ہوئیں، حضرت ابوبکرؓ کی مساعی سے حضرت عثمان غنیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ اور سعدؓ بن وقاص بھی مسلمان ہوئے، اس جماعت کی تعداد بڑھنے میں تین سال لگ گئے، غیر مسلموں کے خوف سے اس کی تبلیغ خاموشی سے ہوتی رہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ایذا رسانی کے ڈر سے مکہ سے باہر جاکر پہاڑ کی گھاٹیوں میں مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرتے، وہاں بھی غیر مسلم پہنچکر جھگڑا کرتے جس سے خون بہنے کی نوبت آجاتی (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم عربی ص ۱۱۶۹، اردو ص ۷۵)، نبوت کے تین سال کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم ملا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ	پس تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کو
اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ	کھل کر کہہ دے اور مشرکین سے دور ہوجا،

اس حکم کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گلی کوچوں میں جاکر اسلام کی تبلیغ شروع کی، کبھی دعوت میں بلاکر احکام الٰہی سناتے، کبھی کوہ صفا پر چڑھ کر پیام دیتے، مکہ کے غیر مسلموں نے آپ کی اس تبلیغی مہم کو پسند نہیں کیا، ابولہب کے ساتھ مکہ کے اور سرداروں نے آپ کے خلاف مہم شروع کی، آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے آپ کے دروازے پر غلاظتیں

پھینکی گئیں، ان ایذا رسانیوں سے عاجز ہوجاتے تو آپ صرف اتنا فرماتے "فرزندانِ عبد مناف
کیا ہمسائگی کا یہی حق ہے، جو ادا کر رہے ہو" (طبری جلد اول حصہ سوم عربی ص ۱۱۹۹، اردو
ص ۱۰۰) ایک روز آپ خانہ کعبہ میں نماز ادا کر رہے تھے، تو آپ جب سجدے میں گئے تو
عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس کو کھینچنا شروع کیا، ایک
اور موقع پر جب آپ نماز میں مصروف تھے، تو ابو جہل کے اشارے پر اونٹ کی اوجھڑی
آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی گئی، آپ کو شاعر، مجنون، ساحر، اوروں سے سن سنکر
افسانے بنانے والا، قوم میں پھوٹ ڈالنے والا، مکہ کو اجاڑنے والا، بھائی کو بھائی سے،
بیٹے کو ماں سے جدا کرنے والا کہا گیا، نبوت کے چھٹے سال ایک روز آپ خانہ کعبہ میں وعظ
کہہ رہے تھے تو ابو جہل وہاں پہنچ گیا۔ اس نے آپ کو گالیاں دیں، پھر بری طرح ستایا،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا، بے بسی کے ساتھ گھر واپس ہوگئے،
آپ کے دوسرے چچا حضرت حمزہؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان کو ابو جہل
کی زیادتی کی خبر ہوئی تو آپ کی مظلومیت سے متاثر ہوئے، ابو جہل کے پاس پہنچے، اس کے
سر پر اس زور سے کمان ماری کہ وہ زخمی ہوگیا، اور جب ابو جہل کے حامی ان سے الجھے تو
وہ اسی وقت مسلمان ہوگئے (مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۹۳، طبری ج ۱ حصہ سوم عربی ص ۱۱۸۷
اردو ص ۹۰، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۲۳، مہاجرین حصہ اول ص ۱۷۰)

تبلیغ میں آلام و مصائب

حضرت عمرؓ اور ان کے گھر والے اسلام لائے تو اسلام کی قوت
بڑھی، مسلمان ابتک چھپ کر اپنے گھروں میں نماز ادا کیا کرتے تھے، اب کعبہ میں جا کر پڑھنے
لگے، اس سے غیر مسلموں کا اشتعال اور بھی بڑھا، انھوں نے بنو ہاشم کا مقاطعہ شروع کر دیا،
ان سے رشتے ناطے اور لین دین بند کر دیے، ان کا گلیوں میں نکلنا روک دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے مجبوراً گھر بار چھوڑ کر اپنے فدائیوں کے ساتھ شعبِ ابی طالب کی گھاٹیوں میں پناہ لی،
یہاں تین برس تک پناہ گزیں رہے، کھانے پینے کے سامان کی کمی کی وجہ سے بچے بھوک
سے بلکتے رہتے، پناہ گزیں پتیاں کھا کھا کر صبر و استقلال سے دن کاٹتے رہے، تین سال
کے بعد غیر مسلموں نے ان کو گھر آنے کی اجازت دی (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۹،
سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۴۵)

یہاں سے نکلنے کے بعد آپ مکہ سے باہر نکل کر تبلیغ کے لیے زید بن حارث کے ساتھ
طائف تشریف لے گئے، وہاں آپ کو پتھروں سے اس طرح لہو لہان کیا گیا کہ
آپ زخموں سے نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے، زید بن حارث بازو تھام کر کھڑا کر دیتے،
طائف سے واپس ہوئے تو آپ پر مایوسی طاری نہیں تھی، ان مخالفوں کے لیے تباہی
کی کوئی بد دعا بھی نہیں کی، آپ کو یقین تھا کہ اگر اس وقت وہ سیدھی راہ پر نہیں آئے ہیں
ہیں تو ان کی آیندہ نسلیں ضرور خدائے واحد پر ایمان لے آئیں گی، اس لیے بد دعا
کے بجائے آپ نے یہ درد انگیز دعائیں مانگیں:

"خداوندا! میں اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی
مجبوری کی شکایت تجھ سے کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے
تو میرا رب ہے، تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے، کسی اجنبی کے جو مجھ پر ظلم کرے یا تو نے
میرے معاملہ کو کسی دشمن کے حوالے کر دیا ہے، اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو میں
ان مصائب کی پروا نہیں کرتا، تیری حمایت میرے لیے بہت زیادہ وسیع ہے،
میں تیرے اس نور کی پناہ میں آتا ہوں، جس سے تمام تاریکیاں روشن
ہوگئی ہیں اور جس پر دنیا و آخرت میں کامیابی کا مدار ہے، اس بات سے پناہ

مانگتا ہوں کہ تیرا غصہ اور غضب مجھ پر نازل ہو، بے شک جب تک چاہے تجھے عتاب کرنے کا حق ہے۔ اور ہر قسم کی طاقت اور قوت حاصل ہے (تاریخ طبری جلد اول حصہ سوم عربی ص ۱۲۱، اردو ترجمہ ص ۱۰۲-۱۰۱)

اس دعا سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغی مہم کے لیے زور اور زبردستی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

رسول اللہ ؐ کی تبلیغی مہم جاری رہی۔ حج کا زمانہ آتا تو زائرین خانہ کعبہ کے پاس پہنچتے اور اللہ کا پیام سناتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے جن میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلے مشہور تھے، آپ وہاں بھی پہنچ کر توحید کا درس دیتے، بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرہ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نصر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ اور حضارمہ جیسے قبیلوں میں بھی ایک تبلیغی مشنری کی حیثیت سے پہنچے، ابو لہب آپ کے پیچھے پیچھے جاتا اور جو کچھ آپ فرماتے اس کی تکذیب کی کوشش کرتا۔ (مستدرک حاکم جلد اول ص ۱۵، سیرۃ النبی جلد اول ص ۵۳-۲۵۲)

آپ کی ایذا رسانی سے غیر مسلموں کو تسکین نہیں ہوئی تو انھوں نے آپ کے سر مبارک کو قلم کرنے کا ایک بڑا انعام مقرر کیا، جب کوئی قتل نہ کر سکا تو عرب کے ہر قبیلہ کے سرداروں نے آپ کے قتل کے لیے آپ کا گھر گھیر لیا، جس کے بعد آپ نے حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ گھر چھوڑ کر غار ثور میں پناہ لی، گھر چھوڑ رہے تھے تو کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔" یہ ایک دل دوز اور دلفگار صدا تھی، تین روز تک غار ثور میں پناہ لینے کے بعد مدینہ کی طرف بڑھے، غیر مسلموں نے آپ کی گرفتاری پر ایک سو اونٹوں کا انعام مشتہر کیا، اس لالچ میں سراقہ بن جعشم

نے آپ کا تعاقب کیا، مگر رحمۃ للعالمین کے ساتھ رب العالمین کی تائید تھی، آپ اپنے یار غار حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ مدینہ محفوظ پہنچ گئے، اس موقع پر اپنے تمام اہل و عیال کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے مکہ ہی میں چھوڑ دیا تھا، جن میں آپ کی بیٹیاں حضرت فاطمہؓ اور حضرت زینبؓ اور چہیتی بیوی حضرت عائشہؓ بھی تھیں (صحیح بخاری ہجرۃ النبی ؐ و سیرۃ النبی ؐ جلد اص ۲۷۱) اسماء بنت ابو بکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے باپ حضرت ابو بکرؓ کے جانے کے بعد قریش کے کچھ لوگ جن میں ابو جہل بن ہشام بھی تھا میرے یہاں آئے اور دروازے پر آکر کھڑے ہو گئے، میں اندر سے نکل کر انکے پاس آئی، انھوں نے پوچھا تمہارے باپ ابو بکر کہاں ہیں؟ میں نے کہا خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں، اس پر ابو جہل نے جو بہت ہی خبیث اور زشت خو تھا، میرے گال پر اس زور سے طمانچہ مارا کہ میرے کان کی بالی گر پڑی، اس کے بعد وہ سب چلے گئے، تین دن تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہیں۔ (طبری جلد اول حصہ سوم ص ۱۲۴۰ اردو ترجمہ ص ۱۳۲)

ان تمام ایذا رسانیوں تکلیفوں اور صعوبتوں میں آپ نے صبر، تحمل، استقلال، عفو و درگزر اور ترحم کی جو مثالیں پیش کیں، وہ اس متمدن دنیا کے لیے مشعل ہدایت ہے، جس میں انتقامی جذبے میں ہولناک لڑائیاں لڑنا قومی شعار بن گیا ہے، اور لڑ کر علاقے کو تباہ اور برباد کرنا کوئی شرمناک فعل نہیں سمجھا جاتا ہے۔

اسلام کی راہ میں صحابہ کرام کے مصائب

پھر مکہ کے جو لوگ اسلام لائے ان کی ایذا رسانی کی بھی کوئی حد نہ تھی، حضرت بلالؓ کے آقا امیہ بن خلف نے ان کو گرم ریت پر لٹایا، تپتا ہوا پتھر ان کے سینہ پر رکھا، ان کی مشکیں باندھ کر ستایا، ان کی گردن میں رسی ڈال کر

مکہ کی پہاڑیوں میں گھسٹوایا، ان تمام مصیبتوں میں ان کی زبان سے صرف احد احد کے نعرے نکلتے" (اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۰۶، مہاجرین جلد اول ص ۱۸۷)

حضرت عثمانؓ بن عفان مسلمان ہوئے تو ان کے چچا نے کھجور کی رسی سے باندھکر مارا، (طبقات ابن سعد، تذکرہ حضرت عثمانؓ بن عفان، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۳۲، تاریخ اسلام از شاہ معین الدین احمد ندوی ج ۱ ص ۲۴۶)، زبیرؓ بن العوام جب سولہ برس کے تھے تو اسلام لائے، غیر مسلموں نے ان کو چٹائی میں لپیٹ کر باندھ دیا اور اس قدر دھواں دیا کہ ان کا دم گھٹنے لگا، ان کی زبان سے صرف یہ نکلا کچھ کرو، اب میں کافر نہیں ہو سکتا، (اصابہ ج ۱ تذکرہ زبیرؓ، مہاجرین حصہ اول ص ۷۹)

حضرت طلحہؓ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ایمان لائے تو ان کے حقیقی بھائی نے ان کو اور حضرت ابوبکرؓ کو ایک ہی رسی میں باندھ کر مارا (اسد الغابہ ج ۳ ص ۵۹، مہاجرین حصہ اول ص ۱۰۰-۹۹)

حضرت عبد اللہؓ بن مسعود اسلام لائے تو غیر مسلموں کے سامنے کلام پاک پڑھنا شروع کیا، انھوں نے ان کو اتنا مارا کہ ان کا چہرہ ورم کر گیا، پھر بھی ان کی زبان بند نہیں ہوئی، اور صرف اتنا کہا کہ دشمنان خدا آج سے زیادہ میری نظر میں کبھی ذلیل نہ تھے (اسد الغابہ تذکرۃ عبد اللہؓ بن مسعود، مہاجرین حصہ اول ص ۳۶۵)

حضرت عمارؓ بن یاسر جب حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو غیر مسلموں نے ان کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرف سے گذرے تو انکے سر پر دست مبارک پھیر کر صرف اتنا فرمایا "اے آگ تو ابراہیم کی طرح عمار پر ٹھنڈی ہو جا، حضرت عمارؓ کی والدہ حضرت سمیہؓ کو ابو جہل نے نہایت بے رحمی سے اپنے نیزہ سے شہید کیا، عمارؓ کے والد حضرت یاسرؓ

اور ان کے بھائی حضرت عبد اللہؓ بھی اسی راہ میں جاں بحق ہوئے، ایک بار حضرت یاسرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ایذا رسانی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا صبر کرو صبر کرو، پھر دعا کی کہ "اے خدا آل یاسر کو بخش دے"، آپ جب حضرت عمارؓ کے گھر سے گذرتے تو اس خاندان کی مصیبت کو دیکھ کر فرماتے "اے آل عمار تمھیں بشارت ہو، جنت تمھاری منتظر ہے (طبقات ابن سعد قسم اول جزء ثالث ص ۱۷۸، مہاجرین حصہ اول ص ۳۴۴)

حضرت صہیبؓ بن سنان مکہ میں غیر مسلموں کے مظالم سے تنگ آ گئے تو مدینہ ہجرت کرنے کو تیار ہوئے، غیر مسلم سد راہ ہوئے تو انھوں نے ان کو اپنا ترکش دکھا کر کہا "تم جانتے ہو کہ میں تم لوگوں سے زیادہ صحیح نشانہ باز ہوں، خدا کی قسم جب تک اس میں ایک تیر بھی ہے تم میرے قریب نہیں آ سکتے، اس کے بعد اپنی تلوار سے تمھارا مقابلہ کروں گا، اگر مال و دولت چاہتے ہو تو اس کو لیکر میرا راستہ چھوڑ دو"، غیر مسلم اس پر راضی ہو گئے، اور حضرت صہیبؓ اپنا سب کچھ لٹا کر اپنے ایمان کی خاطر مدینہ پہنچ گئے (طبقات ابن سعد قسم اول جزء ثالث ص ۱۶۳، مہاجرین حصہ اول ص ۳۵۶)

حضرت عثمانؓ بن مظعون سے برہم ہو کر ایک غیر مسلم نے ان کو اس زور سے طمانچہ مارا کہ ان کی ایک آنکھ زرد پڑ گئی، جب ان کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو بولے خدا کی حمایت سب سے زیادہ امن و ذی عزت ہے، اور جو میری آنکھ صحیح ہے وہ بھی اپنے رفیق کے صدمہ میں شریک ہونے کی متمنی ہے (اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۸۶-۳۸۵، مہاجرین حصہ اول ص ۳۷۸-۳۷۹)

صحابہ کرامؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے پر ان پر غیر مسلموں کی طرف سے جو مظالم

ڈھائے گئے، ان کی اسی طرح کی مثالیں بکثرت ہیں، گھر سے ان کا نکلنا مشکل تھا، انکی
جانیں غیر محفوظ تھیں، وہ علانیہ عبادت بھی نہیں کر سکتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ان کو ان مظالم سے بچنے کے لیے حبشہ ہجرت کرنے کو فرمایا، پہلا قافلہ گیارہ مرد اور
چار عورتوں پر مشتمل تھا، اس میں حضرت عثمانؓ بن عفان بھی تھے، اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ بھی تھیں، جو حضرت عثمانؓ سے بیاہی ہوئی
تھیں، حبش کے بادشاہ نجاشی پر مکہ کے غیر مسلموں نے دباؤ ڈالا کہ ان کو اپنے یہاں
سے نکال دے، نجاشی نے ان مہاجروں کو اپنے سامنے طلب کرکے ان سے پوچھا
کہ تمھارا مذہب آخر ہم لوگوں کے مذہب سے کیا نرالا ہے جو تم نے اپنا آبائی مذہب
چھوڑ دیا ہے، اس کا جواب حضرت جعفرؓ نے بہت ہی موثر انداز میں دیا، بادشاہ
کے سامنے نڈر ہوکر ایک تقریر کی، جس میں یہ بتایا کہ ہم ایک جاہل قوم تھے، بتوں
کو پوجتے تھے، مردے کھایا کرتے تھے، بدکاریوں کے عادی تھے، دلوں میں رحم نہ تھا،
پڑوسیوں کے ساتھ برا برتاؤ رکھتے، ہمارا زبردست فرد دوسرے زیردست فرد کو
کھا جاتا، اتنے میں ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہوا جس کے صدق، امانت، شرافت کو ہم
جانتے ہیں، اس نے ہم کو خدائے واحد کی طرف بلایا، اور سکھلایا کہ ہم پتھروں کو
پوجنا چھوڑ دیں، ہم کو بتایا کہ ہم سچ بولیں، امانت ادا کریں، صلہ رحمی کریں، پڑوسیوں
کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں، حرام باتوں اور خونریزی سے احتراز کریں،
فواحش سے باز آئیں، جھوٹ نہ بولیں، یتیم کا مال نہ کھائیں، عورتوں پر تہمت نہ
لگائیں، خدائے واحد کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں، نماز پڑھیں، روزے
رکھیں، ہم نے اس کو مانا، اس پر ایمان لائے، اب جب کہ ہم نے شرک چھوڑ کر خدا پرستی

اختیار کی، حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا تو اس پر ہماری قوم دشمن ہوگئی ہے،
ہم کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے لگی کہ ہم پھر خدا پرستی کو چھوڑ کر اصنام پرستی
شروع کردیں (سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۸۲-۱۸۱، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۳۸،
مہاجرین جلد اول ص ۴۵)

سیرۃ ابن ہشام کے مولف کا بیان ہے کہ اس تقریر کو سن کر نجاشی اور اسکے
درباری اسقف پر رقت طاری ہوگئی اور نجاشی نے کہا کہ یہ اور عیسیٰؑ کا لایا ہوا مذہب
ایک ہی چراغ کے دو پرتو ہیں،

یہ مہاجرین کچھ دنوں حبشہ میں رہ کر پھر مکہ واپس آگئے، لیکن ان کے مصائب
ابھی ختم نہیں ہوئے، غیر مسلموں کے مظالم پھر بڑھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے دوبارہ حبشہ کی ہجرت کی اجازت دیدی، ۸۳ مردوں اور ۲۰ عورتوں کا یہ قافلہ
پھر کسی نہ کسی طرح حبشہ روانہ ہوگیا،

ان ناساز گار حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ جاری رہی، رفتہ رفتہ بنو ہاشم، موالی بنو ہاشم،
بنو مطلب، بنو مطلب کے حلیف، بنو عبد شمس، بنو شمس کے حلیف، بنو نوفل، بنو اسد
بنو عبد دار، بنو عبد بن قصی، بنو زہرہ بن کلاب، بنو تیم بن مرہ، بنو مخزوم بن یقظہ
بنو عدی، بنو سہم، بنی جمح، بنو عامر بن لوئی، بنو فہرس، مالک، بنو اسد بن عبد العزیٰ
بنو عبد دار بن قصی اور ان کے حلیفوں میں سے کچھ لوگوں نے اسلام
قبول کرلیا (مزید تفصیلات کے لیے دیکھو مہاجرین حصہ اول مقدمہ ص ۵۷-۵۰)
پھر بھی ان کی تعداد غیر مسلموں سے بہت کم تھی، جن کی ایذا رسانیاں جاری رہیں،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقع پر تبلیغ اسلام فرماتے رہتے تھے، مدینہ کے لوگ

آپ کی تعلیم سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے لگے، تو مدینہ دار الامن بن گیا، یہاں پناہ ملنے کی امید ہوئی تو مسلمانوں کی ہجرت شروع ہو گئی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے وہاں کافی مسلمان پہنچ گئے، یہ جلا وطنی اسلام کی راہ میں بہت بڑی قربانی تھی،

یہ تفصیلات کچھ نئی نہیں ہیں، بلکہ اسلام کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عام ہیں، دار المصنفین کی مطبوعات میں سے سیرۃ النبی، مہاجرین حصہ اول و دوم، تاریخ اسلام جلد اول میں اس درد بھری داستان کی اور بھی زیادہ تفصیلات ملیں گی، ان کو یہاں پر مختصر طریقہ سے دہرانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے ناظرین کے سامنے ایک بار پھر یہ حقیقت سامنے آجائے کہ ظالم قاہر، جابر اور عدم رواداری کون تھا، اور کون مظلوم، مقہور، مجبور اور رواداری برت رہا، تشدد کس کی طرف سے جاری رہا، عدم تشدد کو کس نے اپنا وطیرہ بنایا، تلوار کس کے ہاتھ میں تھی، نہتا کون تھا، اسلام زور، جبر اور سختی سے پھیلا، یا ایثار، قربانی، امن پسندی، صلح جوئی، بے سرو سامانی، پُر امن تبلیغ، جذبۂ فدویت، صبر، تحمل، بردباری اور رواداری سے بڑھا اور بڑھتا گیا، (باقی)

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

اس میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی دلچسپ اور دلکش داستان تاریخ کے مستند ماخذوں اور حوالوں سے پیش کی گئی ہے، قیمت ۵؍

عہد نبوی و عہد صحابہ میں مذہبی رواداری کا خوش آیند، سبق آموز اور قابل اتباع اسوہ زیر طبع ہے جو عنقریب طبع ہو کر منظر عام پر آئے گا۔

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن

جدید عربی شاعری کا تنقیدی مطالعہ

از

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم، اے، پی، ایچ، ڈی صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی

جدید عربی شاعری درحقیقت جنگ عظیم کے بعد کی شاعری کو کہنا چاہیے مگر اس مضمون میں ادب عربی کی متداول تاریخوں کے طرز پر اس کا آغاز نپولین کے مصر پر حملہ اور محمد علی پاشا کے عہد سے قرار دیا گیا ہے۔ (معارف)

جدید عربی شاعری وسعت و عظمت کے لحاظ سے بڑی اہمیت کی مالک ہے، اسکی تجدید کا سہرا بارودی کے سر ہے، مگر اس تجدید کو قدیم شاعری کے خلاف بغاوت سے تعبیر نہ کرنا چاہیے، اسلیے کہ جدید شاعری اچانک نہیں پیدا ہو گئی، بلکہ تدریجی طور پر عرب شعراء قدامت کے راستے سے تجدید کی شاہراہ تک پہنچے ہیں، جدید شاعروں نے فکر و فن کے لئے پہلے عباسی شعراء کی تقلید کی اور "عہد عثمانی" یا عصر ترکی کے شعرا کو پس پشت ڈال دیا، اس جاندار تقلید نے ان کے اندر فن کی پختگی اور عظمت پیدا کی، یہ کیفیت بارودی، شوقی، حافظ، رصافی اور زہاوی سب کے یہاں نمایاں ہے، پھر ان لوگوں نے مغرب کے نئے رجحان سے اپنے فن کو نئے آفاق دکھائے، نئے خیالات، نئی امنگوں اور نئے حوصلوں سے اپنی شاعری کو نئی زندگی و تابندگی عطا کی، اور یورپی ادب کی جدید جلوہ طرازیوں سے اس کے اندر نئی چمک دمک پیدا کی۔ بارودی اور شوقی وغیرہ کے یہاں تجدید کی کوشش میں قدیم ادب کے احیاء کی سعی

کی گئی ہے، اسی بنا پر ان کے یہاں جدیدیت ایک محدود و مخصوص انداز میں نظر آتی ہے،
قالب وہیئت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، حافظ کہتے ہیں:

آن یا شعراء ان نفك قیودا   قیدتنا بها دعاة المحال

اے شعرا وقت آگیا ہے کہ ہم محال امور کے داعیوں کی قید و بند کو توڑ ڈالیں

حافظ نے قید تو نہیں توڑی مگر اتنا ضرور کیا کہ شاعری کو زندگی کا نباض بنا دیا اور سماجی شاعری سے اپنے دیوان کو پُر کر دیا، حافظ سے زیادہ بڑا اور عظیم تجدیدی کام در اصل شوقی نے انجام دیا ہے۔ انھوں نے عربی شاعری میں ڈرامہ نگاری کا آغاز کیا، یہ ایک بالکل نیا قدم تھا، عربی ادب تمثیلی شاعری سے ناآشنا تھا، انھوں نے مصرع کلوپڑا، مجنوں لیلی اور قمبیز وغیرہ ڈرامے لکھے، چونکہ انھوں نے یورپی ڈرامہ کا فنی مطالعہ نہیں کیا تھا، اس لیے تمثیلی شاعری کے لیے نئے اوزان کی تشکیل کی جانب توجہ نہ کر سکے، ورنہ وہ ڈرامہ کی معراج تک پہنچ جاتے، عملی طور پر بھی ان کے ڈرامے کمزور سمجھے گئے، ڈرامہ کے لیے اسٹیج کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے،

در اصل اس دور میں کمی بنیادی نظریہ کی ہے، حافظ و شوقی کسی کے یہاں بھی فلسفۂ حیات، فلسفۂ فطرت اور اعتماد و ایقان کی انقلاب انگیز کیفیت نہیں پائی جاتی ہے، محض جدید ایجادات و اختراعات کا ذکر یا سیاسی و سماجی واقعات کا بیان ہی تجدید شاعری نہیں ہے۔

جدید تصور شاعری ایک تصور حیات اور ایک نظام فکر ہے، شعرا ایک نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر شعر کہتے ہیں، اور زندگی کو اسی پیمانے سے ناپتے ہیں، شاعری کو اتفاقی الفا قرار دینا دور جدید کا انداز فکر نہیں ہے، اب تو "شعوری الہام" ہوتا ہے، ایک فلسفۂ حیات

کے ذریعہ آلام روزگار، کا حل اور ایک مربوط و منظم نظام حیات کی راہ سے مسائل کی تلاش، انسانی طبقات کے کچلے ہوئے افراد سے ہمدردی اور غمگساری تجدید کی اعلیٰ قدر ہے، یہ تغیر حافظ و شوقی کے بعد پیدا ہوا اور شعراء نے مغرب سے کسب فیض کیا، مثلاً اکثر جدید شعراء اور شعرائے مہجر رومانوی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں، تقلید کا یہ عالم ہے کہ بہت سے عرب شعراء نے عربی انداز چھوڑ کر بالکل مغربی انداز کی نظمیں لکھنی شروع کر دیں، انکی نظر میں عربوں کا اسلوب شاعری دور جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ فن کے پیمانے کسی قوم کے اندر ایک طویل عرصہ کے بعد وجود میں آتے ہیں، ان کو اچانک متروک قرار دینا آسان نہیں ہے، عربی شاعری کے روایتی طرز کو ترک کر کے پورے طور پر مغربی انداز کا اختیار کر لینا ممکن نہیں ہے، اسی بنا پر آزاد نظموں کو ابتک اتنی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جتنی قدیم اصناف سخن کو حاصل ہے، قدیم فنی روایتوں کو طاق نسیاں کے حوالہ کیے بغیر بھی جدید راہوں پر گامزنی کی جا سکتی ہے، مثلاً بہت سے شعراء نے عربی شاعری کے قدیم طرز پر بھی عمدہ اور موثر نظمیں لکھی ہیں اور جدید انداز میں بھی شعر لکھکر شاعرانہ عظمت و کمال کے جلوے دکھائے ہیں، شعرائے محافظین یعنی بارودی، حافظ اور شوقی وغیرہ کی کامیابی کا راز یہی ہے، اس کے برعکس اس طبقہ کو جو محض یورپ کا نقال ہے، زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیونکہ اس نے مغربی افکار و تصورات کو مغربی اسالیب میں پیش کرنے کی کوشش کی،

جدید عرب شعرا نے مغربی فلسفہ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے، اس لیے ان کے یہاں سطحی تقلید ہے، اسی بنا پر مغرب زدہ شاعری میں بھی کوئی خاص لذت و حلاوت نہیں ملتی، یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک کہ عربی اور مغربی مآخذ سے یکساں

کسب فیض نہ کیا جائے۔[1]

مغربی ذوقِ سخن پیدا کرنے کے لیے صرف یورپی تہذیب ہی سے کسب فیض کافی نہیں ہے، بلکہ یورپی اساطیر اور یورپی فلسفہ کا عمیق مطالعہ بھی ناگزیر ہے، طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب "حافظ وشوقی" میں لکھا ہے کہ شوقی اگرچہ فرانسیسی جانتے تھے، مگر انھوں نے فرانسیسی ڈرامہ اور ادب کا گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا، اس وجہ سے ان کے کلام میں زیادہ گہرائی نہ پیدا ہوسکی۔ مغربی تہذیب نے خود قدیم یونانی، رومانی اور عربی علوم وفنون اور تہذیب و تمدن سے اپنا چراغ روشن کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جدید عربی شاعری میں کوئی "اقبال" پیدا نہ ہوسکا، مگر جہاں تک موضوعات شاعری کا سوال ہے، اس میں ہمیں مایوسی نہیں ہوتی، عربوں نے جدید شاعری کا ایک عظیم ذخیرہ ہمارے سامنے پیش کردیا ہے، جو قوس وقزح کی طرح رنگین، بوقلموں اور دلکش و پرکیف ہے، اس میں قدما کی طرح شکوے، مبارکبادیاں، تاریخ پیدائش و وفات، مراثی و غسل صحت، اور قصائد و ہجویات کا ذخیرہ پایاں نظر نہیں آتا، مگر اس میں اجتماعی اور انفرادی انسانی زندگی کے متعلق جذبات و احساسات کا گہرا شعور نظر آتا ہے اور سیاسی، وطنی، معاشی اور معاشرتی حالات کی موثر تصویر نگاہ کے سامنے آجاتی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جدید عربی شاعری کا آغاز دراصل نپولین کے حملے سے ہوتا ہے، نپولین نے ۱۷۹۸ء میں مصر پر حملہ کیا، اس نے نہ صرف مصریوں میں نئی زندگی پیدا کی بلکہ اپنے ساتھ ماہرین آثار قدیمہ کی ایک جماعت بھی لایا جس نے مصر کی قدیم تہذیب اور عہد رفتہ کی عظمت کو زمین کے سینوں سے کھود کر نکالا، انھوں نے فرانسیسی زبان میں رسالے بھی

[1] الفن ومذاہبہ فی الشعر العربی [illegible] شوقی ضیف ص ۵۱۳ – ۵۱۹

جاری کیے، اس طرح اہل مصر کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔

عرب ملکوں میں اہل یورپ نے بہت سے مشنری ادارے قائم کیے، روس، امریکہ اور فرانس نے اس طرح کے کالج لبنان میں کثرت سے کھولے، چونکہ عربوں میں مذہبی پختگی تھی اس لیے ان کو عیسائی بنانے میں تو کامیابی نہ ہوسکی مگر فرنگیوں کی ہوشیاری نے انھیں اپنا آلۂ کار بنالیا، ڈاکٹر احمد امین فیض الخاطر میں لکھتے ہیں کہ عربوں میں غیر ملکی درسگاہیں کثرت سے کھولی گئیں حتی کہ صرف شام میں ان کی تعداد ۲۰۰۰ تک پہنچ گئی، یہ صرف امریکی مشنریوں کے مدارس تھے جو گاؤں اور شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، چھوٹے بچوں کی درسگاہوں سے لیکر اعلیٰ تعلیمی ادارے غیر ملکی مشن چلاتے تھے، بیروت، قاہرہ اور استنبول میں امریکن یونیورسٹیاں قائم تھیں، ان اداروں میں مسلم طلبہ کو زبردستی چرچ لیجایا جاتا تھا، اور ان سے عیسائی طرز پر عبادت کرائی جاتی تھی، جب طلبہ نے احتجاج کیا تو اصحاب حل وعقد نے کہا کہ ہم مالداروں سے بڑی بڑی رقمیں عیسائیت کی تبلیغ کے نام پر حاصل کرتے ہیں، اگر ہم مذہب کا عنصر نکالدیں تو ہمیں کون مدد دیگا۔[1]

یہ ادارے سیاسی طور پر استعمار کی جڑوں کو مضبوط کرنے، طلبہ کے ذہن میں الحاد پیدا کرنے اور مذہبی شکوک کو ابھارنے کی کوشش کرتے تھے، ان اداروں نے عربوں میں جدیدیت، اصلاحِ شعر و ادب کا خیال دلایا۔

فرانسیسیوں نے ایسے تھیٹر بھی قائم کیے جن میں ڈرامے دکھاتے تھے، مصر میں انھوں نے دو ایسے جدید مدرسے بھی قائم کیے جن میں فرانسیسی لڑکوں کی تعلیم کا انتظام تھا، ایک بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں یورپ کی بے شمار جدید کتابوں کے ساتھ عمدہ اور

[1] فیض الخاطر ج ۱۰، ص ۱۵۰

نادر عربی تصنیفات بھی تھیں، اور وہ مخطوطات بھی تھے جو انھوں نے مسجدوں اور دوسری جگہوں سے جمع کر لیے تھے، جو اس کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا وہ بڑی خوشی سے اس کو اجازت دیتے تھے،[۵]

اسی کے ساتھ فرانسیسیوں نے ایک مجلس "المجمع العلمی" کے نام سے قائم کی جو حکومت مصر کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مواد فراہم کرتی تھی، اس مجلس کے ذریعہ بہت سے اقتصادی، تاریخی اور ثقافتی امور سامنے آئے اور مصر کے قدیم تہذیبی آثار نمایاں ہوئے اور ایک کتاب وصف مصر (Description of Egypt) کے نام سے شائع کی، ازہر کے ۹ علماء کو نپولین نے مصری حکمراں مجلس میں شریک کیا، اس ترکیب سے مصریوں کو حکومت میں شرکت کا خیال دلا کر ترکوں کی طرف سے استبداد کا خیال ذہن نشین کیا،

محمد علی جب مصر کا والی ہوا تو ایک طرف اس نے اعلیٰ قسم کی جدید درسگاہیں کھولیں اور دوسری طرف طلباء کے ایک گروہ کو جدید علوم وفنون کی تحصیل کے لیے فرانس روانہ کیا جو آگے چل کر مصر اور یورپ کے درمیان واسطہ بنے، ان لوگوں نے ترجمہ کی مہم چلائی، جدید اصطلاحات وضع کیں اور بہت سا نیا لٹریچر تیار کر دیا،[۶]

اس جماعت میں رفاعۃ الطہطاوی نے کافی علمی خدمات انجام دیں، اسی کے مشورہ سے محمد علی نے زبانوں کا ایک ادارہ قائم کیا جس میں ایک ہزار سے زائد مغربی زبانوں سے کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں، فرانس کے دستور کا ترجمہ بھی کیا گیا، اور بہت سے فرانسیسی شاعروں کا کلام عربی میں منتقل کیا گیا، محمد علی نے ایک اعلیٰ درجہ کا مطبع بھی قائم کیا، جو "المطبعة الامیریہ" کے نام سے مشہور ہوا جس سے الوقائع المصریہ رسالہ نکلنے لگا،

---

۵ تطور الشعر العربی الحدیث ص ۱۳ ۶ ایضاً ص ۱۵

جب اسمٰعیل تخت حکومت پر آیا تو اس کا علمی ذوق محمد علی سے زیادہ ترقی یافتہ تھا، اس نے ساری یورپ کی علمی وتہذیبی ترقیوں کو سمیٹ لینے کا قصد کیا، اس نے ۲۰ وفود تعلیم کے لیے فرانس روانہ کیے،[۷] اس طرح اسمٰعیل کے زمانہ میں اسکولوں، کالجوں، اخبارات اور رسالوں سبھی چیزوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا، چند برسوں میں ملک کی ذہنی حالت بدلنے لگی،

اسی زمانہ میں عربوں میں اپنے قدیم ذخیرۂ علوم کو مرتب کرنے اور پرانے ادب کے احیاء کا خیال پیدا ہوا، اغانی، تاریخ ابن خلدون، وفیات الاعیان وغیرہ بہت سی اہم کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو گئیں، جس کی وجہ سے تصنیف وتالیف کا مذاق سوسائٹی میں عام ہو گیا،

اس سلسلہ میں مستشرقین کی خدمات بھی بہت اہم ہیں، انھوں نے عربی کی نادر کتابوں کو شائع کرنے اور مرتب کرنے میں بڑا حصہ لیا۔

پھر جب انگریزوں کا نفوذ بڑھا تب بھی علمی وتہذیبی سرگرمیاں عربوں میں جاری رہیں، اور مغرب کے اثر سے قومی جذبات برانگیختہ ہونے کی وجہ سے تحریک آزادی پورے جوش کے ساتھ شروع ہو گئی، اسی زمانہ میں سید جمال الدین افغانی اور ان کے شاگردوں کی تحریک اصلاح نے قومی کارکنوں اور حریت کے علمبرداروں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور آزادی کے جذبہ کے ساتھ انھیں اسلام سے بھی وابستہ رکھا، افغانی اور شیخ عبدہ کے اثرات سے اس دور کا کوئی ادیب محفوظ تھا اور نہ شاعر،

سید علی درویش، عبداللہ فکری اور ناصف الیازجی وغیرہ کی شاعری جدید دور

سے بالکل الگ ہے۔ لیکن ان کے بعد انیسویں صدی کے نصف آخر میں جو شعراء سامنے آتے ہیں، ان کے یہاں صنائع و بدائع کسی حد تک کم ہیں بلکہ ان کے اسلوب میں بحتری وغیرہ کے اثرات ہیں، کیونکہ اس زمانہ میں قدیم لٹریچر پڑھنے کا عام ذوق پیدا ہو گیا تھا جسکا ذکر پہلے ہو چکا۔

صالح مجدی جس کا انتقال ۱۸۸۱ء میں ہوا، مصر پر غیر ملکیوں کے نفوذ سے نفرت ظاہر کرتا ہے، اور اپنی سوسائٹی کے احساسات کا اس طرح اظہار کرتا ہے

ومن عجب فی السلم انی بموطنی   اکون اسیرا فی وثاق الاجانب

تعجب کی بات ہے کہ میں امن کی حالت میں اپنے وطن میں غیر ملکیوں کے چنگل میں اسیر پڑا ہوں۔

ولا ینثنی عن مصر فی ای حالۃ   الی اھلہ الا بمسل الحقائب

غیر ملکی جب بھی مصر سے جاتے ہیں تو اپنی جیبیں بھر لے جاتے ہیں۔

وہ اہل وطن سے پکار کر کہتا ہے:

یا بنی الاوطان ھیا   خیموفوق الثریا

اے ابنائے وطن آؤ اور ثریا کے اوپر خیمے نصب کرو۔

بارودی کی اس طرز شاعری کو ان کے بعد عبد المطلب، رافعی، تایاتی، جارم اور کاظمی نے اپنایا، یہ شعراء محافظین اس بنا پر کہلاتے ہیں کہ ماضی سے انھوں نے جو وراثت پائی تھی اس کو پوری طرح قائم رکھا، انھوں نے عصر عباسی و اموی کی شاعری کو نمونہ سمجھا اور قرآن سے بھی استفادہ کیا۔[۱] لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، ان شعراء نے اچھا خاصہ تاثر اپنے زمانہ کے حالات سے بھی قبول کیا،

جارم مغرب کے اثر سے تجدد کا دعوی کرنے والے شعرا کا ان الفاظ میں مذاق اڑاتا ہے:

۱؎ شعرائے مصر وبیآتہم فی الجیل الماضی ص ۳۴ تالیف عباس محمد عقاد

جلبوا للقریض ثوبا من الغر   ب ولم یجلبوا سوی الاکفان

شعر کے لیے مغرب سے لباس لائے (لیکن یہ) کفن کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

ثاروا علی تراث امرئ القیس   وصونوا دیباجۃ الذبیانی

امرئ القیس کی وراثت پر حملہ مت کرو اور ذبیانی کی وجاہت کو بچاؤ،

لیکن یہ گروہ جدید احساسات بھی رکھتا ہے، چنانچہ جارم سعد زغلول کے مرثیہ میں ان کی قومی خدمات کو ان الفاظ میں سراہتا ہے،

واصاب فی المیدان فارس امۃ   رفع الکنانۃ بعد طول نضال

ایک امت کے شہسوار کو میدان میں ایک طویل جنگ کے بعد ہلاک کر دیا

من ذالک الثمر الوثوب وذالک   الاسد المزمجر ذو الندا العالی

کون ہے یہ کودنے والا چیتا؟ اور یہ اونچی آواز والا شیر!

سوسائٹی کے مسائل سے بھی یہ شعراء اسی طرح تعرض کرتے ہیں جس طرح سے یہ لوگ وہ موضوعات پیش کرتے ہیں جو قدماء کے یہاں رائج تھے، رافعی اہل عرب کے انحطاط کا نوحہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

الست تری العرب الماجدین   وکیف تھدم مجد العرب

کیا تم شریف عربوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ (اس دور میں) کس طرح عرب کے مجد کو ڈھا رہے ہیں۔

عبد المطلب مغربی تہذیب کے فحش ماحول کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے

یا منزل القرآن نورا   للبصائر والعقول

اے قرآن نازل کرنے والے جو عقل و بصیرت کے لیے نور ہے

عمیت بصائر اھل وا   دی النیل عن وضح السبیل

اہل وادی نیل کی نگاہیں واضح راستہ سے ہٹ گئی ہیں (اندھی ہو گئی ہیں)

قایاتی کہتا ہے:

حذار حذار ان تصلد ظباء کم　فیرتد ذاک الحسن غیر مصون

بچو بچو اس بات سے کہ تمھاری ہرنیاں شکار کر لیجائیں اور پھر یہ حسن غیر محفوظ ہو کر لوٹے ۔

ان شاعروں کے بعد جن شعراء کا دور آتا ہے وہ ان مذکورۂ بالا شاعروں سے کہیں زیادہ تجدد پسند اور مغربی تہذیب سے متاثر ہیں لیکن اس کے بعد بھی وہ فنی طور پر قدیم ہی طرز کی شاعری کے حامل ہیں۔ ان کے یہاں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ شکل کے بجائے معانی میں ہوئی ہیں، اس طبقہ نے وطنی وسیاسی شاعری کو غیر معمولی طور پر فروغ دیا۔ اس طبقہ میں شوقی، حافظ، صبری، کاشف، عزیز فہمی، ماحی، عبدالغنی اور عزیز اباظہ وغیرہ شامل ہیں،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شوقی و حافظ وغیرہ کے ذکر سے پہلے مصر پر مغربی اثرات اور وہاں کے ماحول کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کر دیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں مصر کے کیا حالات تھے،

مصر پر انگریزوں کے تسلط کے بعد وہاں انگریزی تہذیب و تعلیم کا غیر معمولی غلبہ ہو گیا، جو لوگ یورپ سے لوٹ کر آئے اور مصر کی اجتماعی زندگی میں داخل ہوئے یا جو یورپی اشخاص بطور اساتذہ یا اور کسی حیثیت سے مصر کی زندگی میں دخیل ہوئے، انکا اثر عربوں پر ہوا، انگریزی مدارس نے طلبہ کے ذہن میں تبدیلیاں پیدا کیں، اسکے بالکل برعکس ایک وہ تعلیم یافتہ طبقہ تھا جس کی تہذیب اسلامی قدروں کی حامل تھی، اور جس کی تربیت ازہر کے زیر سایہ ہوئی تھی، ان کی فکر کا طرز مذکورہ گروہ سے قطعاً مختلف تھا، اس طرح ایک ذہنی کشمکش پیدا ہو گئی اور ہر چیز قدیم و جدید کے درمیان تقسیم ہو گئی،[۱]

---

[۱] تطور شعر العربی الحدیث ص ۸۰

جدید طبقہ نے مغرب کی اتباع کی دعوت دینی شروع کی اور اخبار و رسائل کے ذریعہ ذہن کو بدلنے کی کوشش کرنے لگے، یہ لوگ مشرقی عادات و اطوار کا مذاق اڑاتے، بسا اوقات دین کا احترام بھی نظر انداز ہو جاتا،

لیکن اس کے برعکس شعراء و ادباء کا اعتدال پسند گروہ عربی شاعری کے گذشتہ سرمایہ سے غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتا ہے۔ ان کے قصائد کا وہی رنگ ہے، ان کی نظمیں اور غزلوں کا اسلوب وہی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ ان شعراء نے کچھ تاریخ سے مدد لی ہے، کچھ زندگی کے واقعات و حوادث سے کام لیا ہے،

پرانے عرب شعراء جب محبوب کے دروازہ پر جاتے تھے تو پاسبانوں کا ذکر کرتے تھے، یہ تمام چیزیں اس دور میں بھی نظر آتی ہیں، حافظ کہتے ہیں کہ میں رات کو جب محبوب کے دروازہ پر گیا تو پاسبان میری تلوار کے خوف سے سو گئے

فغطوا جمیعا فی المنام لیصرفوا　شبا صارمی عنهم وقد کان منهلا

تو سب گر گئے نیند میں تاکہ میری تلوار کی دھار کو اپنے سے دور کر دیں جو کہ میان میں تھی

کاشف کہتا ہے

فتعرض الحراس واحتدموا　لما رأونا نطرق الخدرا

تو جب چوکیداروں نے مجھے رات میں پردے میں جاتے دیکھا تو مجھ سے تعرض کرنے لگے اور خفا ہونے لگے

اسی طرح نسیم کہتا ہے

سموت لها والليل مرخ سدوله　على وحراس الخباء هجود

میں اس تک پہنچا اس حال میں کہ رات سخت اندھیری تھی اور خیمہ کے چوکیدار سو رہے تھے،

اس طرز شاعری کو دیکھکر گذشتہ شعراء سے ان جدید شعراء کا رشتہ بہت قوی نظر آتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ شعراء طبعی شاعری میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں، وصف اور منظر نگاری میں شوقی بہت آگے ہیں،

چونکہ اس دور میں قومی و سیاسی زندگی میں آزادی کے لیے ایک ہلچل برپا تھی اور پورے عرب میں انگریزوں کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس لیے شعراء کا اس قومی زندگی سے متاثر ہونا ضروری تھا، ان میں خاص خاص حوادث جن کا ذکر اس دور کے قریب قریب تمام شعراء کے یہاں ملتا ہے، مندرجہ ذیل ہیں،

"حادثہ" دنشواؤ" (یہ ایک گاؤں کا نام ہے جہاں انگریزوں نے مظالم ڈھائے تھے)، کرومر کا مصر سے جانا، مصری عورتوں کے مظاہرے، ملنر کے قوانین و تصریحات ۱۹۲۲ ۔ سعد زغلول پر زیادتی، شہداء کا ذکر، عبدالحمید کا دستور عطا کرنا، پھر عبدالحمید کا سقوط، جنگ طرابلس، دمشق کا حادثہ جانکاہ، جس میں ہزاروں عرب کام آئے، یہ اور اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن کا عرب شاعروں نے دل کھول کر ذکر کیا ہے۔

کاشف کہتا ہے:

لم هذا النوم عن حفظ الحمى　　وهو يدعوكم ويشكو الالما

ملک کی حفاظت سے یہ غفلت کیا معنی رکھتی ہے جبکہ وہ تم کو پکارتا ہے اور شکوہ سنج ہے،

ولی الدین یکن اختراعات جدیدہ کی تعریف کرتا ہے،

الناس ملوا من المطايا　　فجاء من بعدها البخار

لوگ سواریوں سے اکتا گئے تو پھر بھاپ آئی

وملّه اكثر البرايا　　ثم اعتلوا في السماء فطاروا

اور اس سے بھی لوگ اکتا گئے تو پھر آسمان پر بلند ہو کر اڑنے لگے۔

یا حبذا عصرنا الجدید

خوش آمدید اے ہمارے عصر جدید

جدید عربی شاعری کا ارتقا یورپی اثرات کے تحت ظہور پذیر ہوا، اسی بنا پر اس میں وہ تمام عناصر نظر آتے ہیں جو انگریزی اور فرانسیسی شاعری کا بنیادی سرمایہ ہیں، اس میں وہ تمام ادبی تحریکیں منعکس ہیں جنھوں نے یورپی ادب کو متاثر کیا، چنانچہ جدید عربی شاعری میں رومانیت، رمزیت، سرائیلزم اور دوسری ادبی تحریکوں کے اثرات پوری طرح جلوہ گر و ضوفگن نظر آتے ہیں، دراصل جدید اور قدیم شاعری کا بنیادی فرق بھی اسی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ قدیم شاعری میں قوت، اسلوب کی پختگی اور زبان کی بلندی نمایاں ہے، مگر معانی کے لحاظ سے اس میں تقلید پرستی اور اضمحلال کی کیفیت ہے، اس کے برعکس جدید شاعری معنوی لحاظ سے قوی تر ہے، اس میں پہلی بار عربی شاعری زندگی سے اور مسائل زندگی سے دست و گریباں نظر آتی ہے، بلاشبہ ابتداء سے عربی شاعری کی بنیاد حقائق حیات پر تھی، مگر ابو تمام، متنبی اور ابوالعلا معری نے اس کو فلسفہ کے رنگ میں رنگ دیا، بعد کی شاعری تو بالکل تقلیدی ہو کر رہ گئی جس کا تعلق زندگی سے بالکل نہ رہ گیا،

چونکہ جدید شاعری نے ایک سیاسی اضطراب اور نیم غلامانہ فضا میں جنم لیا اس لیے اس میں سب سے اہم عنصر وطن پرستی ہے، پوری جدید شاعری کا وطن پرستی، قوم پرستی اور علاقہ پرستی کے جذبات سے پر ہے، عربی بولنے والے ہر ملک کے شاعر نے اپنے ملک کی قدیم تاریخ، امتیازات اور ممتاز شخصیتوں پر فخریہ انداز سے نغمہ سرائی کی ہے،

عرب انشاء پردازوں اور مورخوں نے اپنے اپنے ملک کی جانب توجہ کی ہے، اس کا نتیجہ
یہ ہوکہ جدید عربی شاعری کو وطنی شاعری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، مصری اور لبنانی شعراء نے تو وطن
کے نغموں سے اپنے دواوین پُر کردیے ہیں، بعض وقت تو طبیعت ایک ہی موضوع کی
تکرار سے اکتانے لگتی ہے، وطن پرستی کا یہ عفریت بھی یورپ کے اثرات کا نتیجہ ہے،

وطنی شاعری کے بعد رومانی اور سماجی شاعری ہے، واقعہ یہ ہے کہ عرب
شعراء نے زندگی اور زمانہ کی تصویر کشی میں بڑی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے، انھوں
نے سماج کے مختلف طبقات کی ترجمانی کی ہے، خصوصاً غریب و بدحال طبقہ کے جذبات،
احساسات اور قابل رحم حالات کا بیان بڑے مؤثر انداز سے نظر آتا ہے،

وطن پرستی، عربیت اور اسلامی عناصر یہ جدید عربی شاعری کے بنیادی عناصر
ہیں جن کی مثالوں سے شعراء کے دواوین پُر ہیں، یہ عناصر باہم دست وگریباں
نظر آتے ہیں، جدید عربی شاعری میں اقدار اور نظریہ ہائے حیات کی کشاکش و کشمکش پوری
قوت کے ساتھ جاری و ساری نظر آتی ہے، اس میں مغرب کے مقلدین بھی ہیں اور مشرقی
زندگی کے پرستار بھی، اسلام کے تعمیری رجحانات کے علمبردار بھی اور مذہب سے بیزار بھی،
یہاں بنیادی تبدیلی یہ نظر آتی ہے کہ اب شاعری میں جو قدریں ہیں وہ مذہبی یا غیر مذہبی
ہر حال زندگی سے متعلق ہیں، اب شاعری شخصی کیفیات کی ترجمانی اس معنی میں نہ رہ گئی
جیسا کہ پہلے تھی کہ بادشاہ کی مدح، اس کے یہاں ولادت ہو تو تہنیت، بیماری سے
شفا ہو تو قصیدہ اور مرجائے تو مرثیہ، موجودہ شاعری میں موضوعات ہی نہیں بدلے
بلکہ شکل وہیئت تک بدل گئی، یہ تبدیلی عربوں کی صدیوں بلکہ ہزاروں برس کی
تاریخ میں کبھی وجود میں نہ آئی تھی، انھوں نے کبھی شاعری کی ہیئت کو تبدیل نہ کیا تھا،

صرف پوری تاریخ میں اسپین کی عربی شاعری میں ہیئت وقالب کے لحاظ سے ایک نئی
قسم ایجاد کی گئی تھی، جس کا نام تھا "الموشح" بعد میں اس کا رواج بھی عام نہ ہوسکا،
اس کے برعکس دور جدید میں آزاد شاعری اور شعر منثور کا عربوں میں رواج ہوا،
عربی شاعری ایک غنائی شاعری ہے، اس میں نغمہ اور وزن کو اہمیت
حاصل ہے، اسی بنا پر اگرچہ جدید شاعری عربی میں اب بھی مری نہیں مگر اس کو
قبولیت عامہ کا شرف حاصل نہ ہوسکا،

آزاد، مرسل اور شعر منثور کو سب سے زیادہ لبنان میں ترقی کا موقع ملا،
اس کی ایک وجہ تو "شعرائے مہجر" ہیں، سیاسی و معاشی وجوہ کی بنا پر
جو شعراء امریکہ اور یورپ میں جاکر مقیم ہوگئے تھے انھوں نے وہاں کی زندگی سے
پورا فائدہ اٹھایا، اور اپنی شاعری میں یورپی انداز و افکار پیش کیا، قومی
رنگ و آہنگ کو بھی انھوں نے باقی رکھا اور ذاتی رنج ومحن کی تصویر کشی بھی
کی، پھر چونکہ "لبنان" پہلا علاقہ ہے جہاں روسی، فرانسیسی اور امریکی تعلیم گاہیں
قائم تھیں، اس لیے سب سے زیادہ جدید اثرات لبنانی شعراء پر مترتب ہوئے،
اور آج بھی سب سے زیادہ آزاد نظمیں ہم کو انھیں لبنانی شعراء کے دواوین میں نظر
آتی ہیں، یہی نہیں بلکہ انھیں اسباب و وجوہ سے لبنانی شعراء میں تحریک رمزیت
سرریلزم اور رومانوی اثرات مصری، شامی اور عراقی شعراء کے مقابلہ میں
زیادہ گہرے نظر آتے ہیں،

"شعرائے مہجر" میں جو دو جدیدیت کی علمبردار تحریکیں اٹھیں اُن میں دراصل
لبنانی شعراء تھے، تحریک "رابطۂ قلمیہ" اور تحریک "عصبۂ اندلسیہ" درحقیقت

لبنانی ادباء و شعراء کے افکار کی صدائے بازگشت تھیں، ان میں سے بہت شعراء بعد میں لبنان واپس بھی آگئے، مثلاً میخائیل نعیمہ وغیرہ، اس وجہ سے لبنانی شاعری میں وطنیت کی زیادتی اس لیے ہے کہ اکثر شعراء کو جلاوطن رہ کر وطن کی محبت کا لطف تیز سے تیز تر ہوگیا، دوسری طرف براہ راست مغربی زندگی نے انکے شاعرانہ جذبات کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اور ان کے یہاں شاعری میں مادہ و قالب دونوں بدل گئے، یا کم از کم تغیر پذیر ہوکر اور اپنی قدیم شکل بدل کر ہمارے سامنے آئے،

اگرچہ مصر جدید شاعری میں اہمیت کا حامل ہے، یہاں سے دو عظیم ادبی تحریکیں اٹھیں، جنھوں نے عربی شاعری پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے، یعنی تحریک "الدیوان" اور تحریک "اپولو" مگر جہاں تک مغربیت اور جدیدیت کے اثرات کو قبول کرنے کا سوال ہے، اس میں سب سے زیادہ اولیت شعرائے مہجر اور شعرائے لبنان کو حاصل ہے جنھوں نے پہلی بار عربی شاعری کی ہیئت میں تغیر پیدا کردیا اور نئے نئے انداز سے طبع آزمائی کرکے عربی شاعری کے دامن کو وسیع کردیا،

عربی شاعری کا دور جدید انیسویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اجتماعی زندگی میں عربی صحافت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قدیم عربی ادب میں نئی زندگی پیدا کرنے کے عام ذوق و شوق نے لوگوں کے دلوں کو سرشار کردیا، عصر عباسی کے شعرا کا اثر عرب شاعروں پر غیر معمولی طور پر قائم رہا، جس سے وہ رفتہ رفتہ نجات حاصل کرتے رہے، پہلا شاعر جس نے قدما کے پر تکلف اسالیب سے ذرا ہٹ کر اپنی

اپنی شاعری کی بنیاد رکھی، وہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، محمود سامی بارودی تھا، اس نے اپنی قدامت کے باوجود اپنے دور کے رجحانات سے آب و رنگ حاصل کیا ہے، عبد المطلب، رافعی، کاظمی، جارم اور قایانی وغیرہ ایسے شعراء ہیں جو ایک جانب قدیم شاعری کے محافظ ہیں، اور دوسری جانب زمانہ کی رفتار سے مجبور ہوکر سوسائٹی کے تقاضوں کو بھی اپنی شاعری میں پیش نظر رکھتے ہیں،

اس موقع پر یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ جب شام و مصر میں مغربی تہذیب کا چراغ روشن ہوا تو عربوں کو نظر آنے لگا کہ وہ کتنے اندھیرے میں ہیں، اور ان کی تہذیب کتنے پیچھے رہ گئی ہے، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے قومی آزادی کے نشہ سے عربوں میں سیاسی بیداری کا صور پھونکا، جس نے پہلے ترکوں کی حکومت کو ختم کیا، بعد میں وہی جذبۂ حریت ان استعماری طاقتوں کی بیخ کنی میں استعمال ہوا، شعراء نے آزادی کی لہروں سے اپنے دواوین کو متموج و متلاطم بنادیا، انھوں نے عوام کے جذبۂ حریت، وطن کی غلامی و مجبوری، استحصال بالجبر، استعماری مظالم، عربوں کی پستی، قومی بلندی کے حوصلے اور آزادی کے لیے جد و جہد کو پورے زور و شور کے ساتھ اپنی شاعری میں مصور و منور کرکے پیش کیا، اس مقصد کے لیے انھوں نے اسلامی تاریخ سے وہ اوراق زریں لیکر عربوں کے سامنے کردیے، جب کہ وہ فاتح، ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کے حامل اور زندگی میں اعلیٰ اقدار کے ترجمان تھے، اور انھوں نے ساری دنیا میں عدل و انصاف، شرافت و انسانیت اور ادب و تہذیب کی فضا قائم کردی تھی، اس طرح عربوں کے جذبات

برانگیختہ کرکے ان کو شعراء نے عمل واقدام پر ابھارنے کا کام بڑے موثر انداز سے لیا ہے،

یہاں ایک حقیقت اور پیش نظر رکھنی ضروری ہے، وہ یہ کہ جب مغربی تہذیب کا سیل رواں عربوں تک پہنچا اور اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے تو وہ طبقہ جو بالکل مغرب زدہ اور جدیدیت پسند تھا اس نے ہر قدیم کی برائی اور ہر جدید کی تعریف شروع کردی اور مغرب کی تقلید کا پرزور داعی بن گیا، اس طرح عربوں میں دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ایک ذہنی کشمکش اور جدید قدیم کی کشاکش کا آغاز ہوگیا، عربوں میں جامع ازہر کا تعلیم یافتہ طبقہ مذہبی تھا، اب گویا مغربی تہذیب اور اسلامی روایات کا براہ راست تصادم تھا، ایک طرف عربوں کی نگاہیں یورپ کی مادی ترقی سے مبہوت تھیں اور دوسری جانب ماحول، مطالعہ اور تاریخی عظمت کے باعث انکے ذہن میں عربوں کی برتری اور اسلام کی اہمیت جاگزیں تھی، اذہان میں یہ کشمکش جاری تھی کہ عربوں کے سامنے سید جمال الدین افغانی کی عظیم وجسیم شخصیت آتی ہے جنھوں نے اپنے اعلیٰ افکار، اپنے جمہوری نظریات اور اپنے انقلابی واقدامی تصورات سے ہر جگہ ایک ہلچل پیدا کردی، وہ جہاں گئے وہاں انقلاب کے جراثیم اس طرح بکھیر دئے کہ بغاوت ہوگئی اور جمہوریت پسند عناصر پُرجوش و متلاطم ہوگئے، ان کے وجود سے ہر ملک میں جہاں وہ گئے بادشاہوں نے خطرہ محسوس کیا، یہی کیفیت مصر میں ہوئی، مصر کا نیا طبقہ خواہ وہ شعرا کا ہو یا ادبا کا، علما کا ہو یا سیاست دانوں کا، ان سب نے جمال الدین افغانی جیسے بطلِ حریت سے

تاثر قبول کیا، مصر پر افغانی کے بعد ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہٗ کے اثرات بڑے گہرے پڑے، ان بزرگوں نے ادب و دین دونوں کی خدمت کی، جدید شعر وادب کا ذکر ان کے بغیر ادھورا رہ جائے گا، انھوں نے خطرہ محسوس کیا کہ مبادا کہیں عرب اپنی گذشتہ علمی ثقافتی اور اسلامی میراث جدیدیت کے سیلاب میں کھو نہ بیٹھیں، چنانچہ ان کی فکری تحریک نے مغربی استعمار کے خلاف ایک فضا ہموار کردی، جس کا مظہر اعرابی پاشا کی بغاوت میں ظاہر ہوا اور دوسری جانب انھوں نے اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعہ جدید طبقہ کے ذہن کو اسلامی اقدار حیات سے آشنا کیا، افغانی اور محمد عبدہ نے عربوں کے تمام اہل نظر ومفکرین کو متاثر کیا، ان کی اس کاوش کا نتیجہ ہے کہ عرب اگرچہ اپنی معاشرت میں مغرب زدہ ہوگئے مگر اسلام اور عربیت کی برتری کا نقش ان کے فکر وشعور پر غالب ہے، حافظ، شوقی اور زہاوی وغیرہ کی شاعری کو دیکھنے سے اس حقیقت کا ثبوت فراہم ہوسکتا ہے،

بہرحال قدیم وجدید کی کشمکش عربی ادب میں باقی رہی، عربی شاعری میں بھی یہ دونوں انداز فکر موجود ہیں، محمد علی نے یورپ کو بہت سے وفود حصول تعلیم کے لیے روانہ کیے، مگر ان میں ابتدائی دور میں تو کچھ حرکت وعمل کی عظمت نظر آتی ہے مگر بعد میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس انداز سے ترقی شروع ہوئی تھی، وہ جاری نہ رہ سکی، چنانچہ ڈاکٹر احمد امین رقمطراز ہیں کہ رفاعۃ الطہطاوی کے بعد پھر ترجمہ کی مہم بھی کمزور پڑگئی، اور کوئی غیر معمولی تصنیف بھی منصۂ شہود پر نہ آسکی، بعضوں کا خیال ہے ترجموں اور تصانیف کے بارے میں انگریزوں نے

عمداً ایسا رویہ اختیار کیا جس سے عربوں کی ہمت شکنی کیجائے،

اسی کے ساتھ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، عربوں میں قدیم علوم کے احیاء کا جذبہ پیدا ہوا، اس کا آغاز مستشرقین نے کیا تھا، انھوں نے اپنے کتب خانوں میں عربی کتابوں کے عظیم ذخیرے جمع کر لیے، پھر محنت و مشقت اٹھاکر ان کو بڑے اہتمام سے شائع کرنا شروع کر دیا، مصر نے بھی اس کی تقلید کی اور محمد علی نے مطبعہ "بولاق" قائم کیا، ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یورپین علماء عربی کتابوں کو شائع کرتے ہیں، تو وہ بڑی محنت و لگن سے کام کرتے ہیں مگر عرب ممالک میں تجار نفع اندوزی کے لیے یہ کام کرتے ہیں، اس لیے مستشرقین کی کتابیں زیادہ اہمیت وعظمت کی حامل ہوتی ہیں،[1]

یہی عربی و غربی مخلوط انداز فکر شاعری پر بھی محیط ہے، پوری علمی زندگی، شعر وادب اور تعلیم و تفکیر تک میں مغربیت و مشرقیت کی کشمکش جاری ہے

بعض شعراء امرؤالقیس کو اعلیٰ شاعری کا نمونہ تصور کرتے ہیں اور بشار و ابونواس کی مثالوں کو سامنے رکھتے ہیں، مگر مغرب زدہ شکسپیر اور گوئٹے وغیرہ پر جان دیتے ہیں، نثر میں عربیت پرست ابن مقفع، جاحظ اور حریری کو نمونہ تصور کرتے ہیں، مگر مغرب زدہ طبقہ ہیگو اور والٹیر کے شائق ہیں، اس طرح یہ شریعت اسلامیہ کو بہتر تصور کرتے ہیں، مگر مغرب زدہ فرانس اور سوئٹزر لینڈ کے قوانین کے مداح ہیں،

(باقی)

---

[1] فیض الخاطر ج ۱ ص ۲۶۹

اسلامی تصوف کی مابعد الطبیعی بنیادیں

از جناب غلام محمد ادنتو صاحب ریسرچ اسکالر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

اسلام میں تحریک تصوف کے مطالعہ کے لیے بالعموم دو طریقے اختیار کیے جاتے رہے ہیں، ایک طریقہ تو خود مسلمانوں مثلاً شاہ ولی اللہؒ اور ان کے متبعین سید احمد شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ کا ہے جو تصوف کو عین روح شریعت سمجھتے ہیں، انکے خیال کے مطابق اسلام جہاں افراد کے خارجی اعمال کو منضبط کرنے کے لیے مختلف سماجیاتی اداروں کی تشکیل کرتا ہے، اور ان کے لیے قوانین و شرائع وضع کرتا ہے، وہیں وہ ان کے باطنی تزکیہ و تصفیہ کی بھی فکر کرتا ہے، اور اس کے لیے ایک علیحدہ لائحۂ عمل مرتب کرتا ہے، جس طرح شریعت کے احیاء کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، اسی طرح اسلام میں روح شریعت یعنی تصوف کی تجدید بھی ہر زمانے میں ہوتی رہی ہے، اس لیے تصوف کی تاریخ خود اسلام کی تاریخ سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے، اس کے برعکس مستشرقین اس کو غیر اسلامی تحریک قرار دیتے ہیں، انکا خیال ہے کہ تصوف ایک طرف تو وقت کے سیاسی و سماجی حالات سے متاثر ہوا، اور دوسری طرف یہ نوفلاطونیت، زرتشتیت اور ویدانتی فلسفہ کے اثرات قبول کرتا رہا، اسلیے یہ حقیقی اسلام سے ایک علیحدہ چیز ہے،

اگر پہلے نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو تصوف کو اسلام سے ایک الگ بات کے

سمجھنے کی بات ہی بے معنی ہو جاتی ہے، دوسری طرف اس کو سر تا سر غیر اسلامی اثرات کا پروردہ اور زوال کی علامت سمجھنا اس لیے غلط ہے کہ ہر زمانے میں صوفیا نے شریعت سے اپنی وابستگی و وفاداری کا اظہار کیا ہے جو اس کو اسلامی طرز فکر سمجھنے کے لیے کافی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدا تو اس کے ماننے والوں کی سادہ اطاعت اور اتباع سے ہوئی لیکن کچھ ہی برسوں کے اندر جو سیاسی حالات پیدا ہوئے اس بنا پر سکون پسند اور ہنگاموں سے دور بھاگنے والے اصحاب کو گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے کیلیے مجبور کر دیا، یہ گوشہ نشین صوفیا شریعت کے پابند رہے۔ اس کے مبلغ بھی ہر قسم کی اختراع و بدعت سے متنفر تھے، لیکن گوشہ نشینی اور تنہائی پسندی کا جب رجحان بڑھتا گیا تو اعتدال رفتہ رفتہ جاتا رہا، اور غیر اسلامی فلسفوں کے زیر اثر جہاں ایک طرف عقائد میں نوفلاطونی، ویدانتی اور یونانی تصورات کی آمیزش ہوئی وہیں ایسے اعمال و اشغال کو بھی دخل حاصل ہوا، جسے اسلام کی سادگی سے مطابقت دینا مشکل ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صوفیاء کے گروہ میں حکماء کی طرح عقائد و اعمال کو قرآن و سنت سے مطابقت دینے کی شعوری کوشش برابر جاری رہی جس کی وجہ سے تصوف بحیثیت مجموعی اپنی اسلامی حیثیت سے بہت دور نہ ہو سکا، یہاں ضمناً یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ صوفیاء نے جو مبہم اور کثیر المعنیٰ اصطلاحات استعمال کیے تو فقہا کا اعتماد جاتا رہا، اس عدم اعتماد کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ایک صوفی نے کوئی اصطلاح کسی خاص معنے میں استعمال کی لیکن اس کے متبعین نے اس کو دوسری طرح سمجھا اور پھر ان کے مریدوں نے اس کو تیسری طرح پیش کیا جس سے اس کی اصل صورت ہی مسخ ہوتی گئی،

تصوف کا مطالعہ مابعد الطبعیاتی علمی اور اخلاقی حیثیت سے کیا جا سکتا ہے،

زیر نظر مضمون میں ہم صرف پہلے حصے سے بحث کریں گے، مابعد الطبعیات سے مراد یہ ہے کہ شہودی کثرتوں اور تنوعات کے پیچھے کسی واحد حقیقت کی جستجو کیجائے، خدا، کائنات اور روح اس کے خاص موضوعات ہیں، نیز ضمناً اس میں ذات و صفات خداوندی، غائیت، جبر و قدر اور زندگی بعد موت کی بھی بحث آجاتی ہے، یہ مابعد الطبیعی موضوعات فلسفہ اور مذہب کے مشترک موضوعات ہیں، قرآن کا براہ راست مخاطب چونکہ فرد ہے اور فرد کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ان تمام مسائل سے ہے اس لیے ان پر دیگر مذاہب کی طرح قرآن بھی روشنی ڈالتا ہے،

قرآن کے مطابق حقیقت الحقائق خدا کی ذات ہے، جو ہمہ تواں، ہمہ داں، اور ہمہ گیر ہے، وہ تنہا، مطلق اور غیر مرکب ذات ہے، جس کی بیشمار صفات ہیں جنھیں ہم اس کے ناموں کی حیثیت سے جانتے ہیں، خدا نے اپنی مرضی سے کائنات کو عدم سے وجود میں تبدیل کیا، اور ایک مخصوص ارتقائی عمل سے گذار کر اس حد تک تیار کیا کہ انسان اس میں اپنی زندگی گذار سکے، اس نے انسان کی تخلیق سوکھی کھنکھناتی مٹی سے کی، پھر اس کی شکل و صورت متعین کی اور پھر اس میں اپنی روح پھونک دی، جس سے انسان باشعور اور اشرف المخلوقات ہوا، جسم آدم میں روح پھونکنے کے بعد خدا نے اپنی دوسری مخلوق یعنی فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے اطاعت گذار ہوں، اس حکم کے تحت تمام فرشتوں نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے جو کہ ایک جن تھا، سرکشی کی، پھر ابلیس نے حضرت آدم و حوا کو بہکایا جس کے نتیجہ میں خدا نے ان کو ابلیس کے ساتھ زمین پر ایک وقت معینہ تک رہنے کے لیے بھیج دیا، کائنات بے مقصد نہیں پیدا کی گئی ہے، بلکہ اس کا ایک آغاز اور انجام ہے، انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ خدا

کی عبادت کریں، انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے، جبکہ دیگر موجودات کچھ بندھے ٹکے قوانین کی پابند ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو سماجی نظم بہتر طور پر چلانے کی ہدایت دی، وہ اگر ان ہدایات کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کرے گا تو آخرت میں اس کا اجر و ثواب جنت کی صورت میں ملے گا، ورنہ اسے جہنم کا ابدی عذاب برداشت کرنا ہوگا۔

خدا، کائنات اور روح انسانی کی علیحدہ علیحدہ نوعیتوں اور ان میں باہمی تعلق کی نسبت جو تفصیل قرآن نے پیش کی وہ سادہ لوح عوام کو تو مطمئن کر سکتی تھی لیکن فلسفیانہ تجسس رکھنے والے دلوں میں یہ شکوک پیدا ہوتے تھے کہ اگر خدا ایک خاص اور منفرد ذات تھا تو اس کے اندر سے مادی اجسام کا ظہور کس طرح ہوا، نیز یہ کہ اگر خدا تعالےٰ ہی اصل حقیقت ہے تو اس کے مقابلہ میں اس کائنات کا کیا مقام ہے، کیا یہ بے حقیقت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

بعض مسلمان حکما، اور صوفیا، نے خدا اور کائنات کے تعلق کی وہ تشریح نوفلاطونی فکر کے ذریعہ سے کی، فلوطینوس (Plotinus) کے مطابق ذاتِ خداوندی اگرچہ ہر طرح کی کثرتوں اور تنوعات سے پاک و منزہ ہے لیکن ساتھ ہی تمام موجوداتِ عالم جسم و ذہن نیز صورت و مادہ کا منبع ہے، خدا اپنی ذات میں ہر شے کو شامل کیے ہوئے ہے، وہ غیر معلول علت ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا، اور ہر شے اسی سے پیدا ہوئی ہے، کثرت اور وحدت میں گہرا اور ناقابل انقطاع تعلق ہے، وحدت کے بغیر کثرت کا تصور ناممکن نیز اسے موخر الذکر پر اولیت بھی حاصل ہے، وہ ایک ارتفاعی اور انتزاعی وجود ہے جسے صفات سے متصف کرنا اس کو محدود کرنا ہے، حسن

جمال، حق، خیر شعور اور ارادہ وغیرہ سبھی اس کی ذات پر منحصر ہے، اور وہ خود ان سے بلند ہے، ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ سوچتا یا ارادہ کرتا ہے، کیونکہ سوچنا یا ارادہ کرنا اس بات کا متقاضی ہے کہ کچھ سوچا یا ارادہ کیا جائے، اس طرح سے خدا موضوع اور معروض میں بٹ جائے گا اور اس کی انتزاعیت متاثر ہوگی، کائنات کے متعلق فلوطینوس بتاتا ہے کہ اس کی ابتدا خدا کے وجود سے ہوئی لیکن خدا کائنات کا خالق نہیں ہے کیونکہ تخلیق کا انحصار شعور و ارادہ پر ہے، اور خدا ان سے مبرا ہے، یہ خدا کی ارتقا یافتہ شکل بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی ذات میں کامل و اکمل ہے، وہ نظریہ تخلیق کے برعکس نظریہ بروز یا نظریہ صدور (Theory of Emanation) پیش کرتا ہے جس کے مطابق عالم کا صدور خدا کی ذات سے ہوتا ہے، خدا ایک سرچشمہ ہے جہاں سے اشیاء کے دھارے اپنے منبع کی لامتناہیت کو متاثر کیے بغیر مسلسل خارج ہوتے رہتے ہیں، جس طرح سے کہ نوری شعاعیں لامتناہی طور پر اپنے مبدء یعنی سورج سے نکلتی ہیں، تمام اشیائے عالم اپنے وجود کے لیے خدا کی ذات کی حاجتمند ہیں، نیز اس کے مقابلے میں قطعی بے حقیقت ہیں۔

خدا سے عالم کا صدور تین مرحلے میں ہوا، بالکل ابتدا میں صرف خدا تھا، جو خیال مطلق یا عقل مطلق تھا، پھر اس نے ایک مثالی اور کامل ترین کائنات کا تصور کیا اور اس طرح وہ موضوع و معروض میں بٹ گیا، لیکن یہ موضوع و معروض بھی اس کی اپنی ذات ہی تھی، اس نے خود سے خارج کسی شے کا تصور نہیں کیا، اس کا تصور کرنا ایسا ہے کہ تصور کرنے والا، تصور کرنے کا عمل اور تصور کی جانے والی شے ایک ہی ہوتے ہیں، خدا کے اس تصور کرنے سے روح کا

صدور ہوا، روح اس خیال مطلق کا ایک معلول یا عکس یا ظل تھی جس کا صدور
خدا کی ذات سے ناگزیر تھا، کیونکہ ہر تصور یا فکر خود کو منصۂ شہود پر لانے کے لیے جد وجہد
کرتی ہے، یہ روح اپنے جوہر کے اعتبار سے ایک طرف تو خدا سے جڑی ہوئی ہے اور
دوسری طرف اس کا تعلق عالم محسوس سے ہے، اپنی پہلی حیثیت میں یہ خیال ہے اور
تصورات پر غور کرتی ہے، فلوطینوس اسے روحِ عالم کا نام دیتا ہے، دوسری حیثیت
میں یہ عالم طبیعی ہے، اور اپنے اظہار کے لیے مادہ وجود میں لاتی ہے، مادہ اس صدوری
عمل میں اسفل ترین درجہ کا حامل ہے، اور تاریکی و شر کی علامت ہے، مادہ کے اوپر جب
روح اپنا عمل کرتی ہے تو ان کے اختلاط سے محسوس اشیاء کا ظہور ہوتا ہے، کائنات
میں جو حسن، ترتیب، تنظیم اور وحدت پائی جاتی ہے وہ روحِ عالم کے ہی باعث ہے،
جس کا رخ اپنے مبدء یعنی خدا کی طرف ہے،

کائنات اور خدا کے درمیان ابداعی تعلق کی جو نوفلاطونی تشریح اوپر بیان
کی گئی اس میں دو باتیں خاص طور پر توجہ دینے کی ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ فلوطینوس کے
مطابق کائنات خدا کے کسی ارادہ کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی ان دونوں میں کوئی زمانی
تفریق ہے بلکہ خود خدا کی فطرت کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ کائنات کا صدور اس کی ذات سے ہو،
یعنی یہ کہ کائنات بھی خدا کی ہم وجود اور اس کے ساتھ ازلی و ابدی ہے، دوسری بات
یہ تھی کہ اس نے کائنات اور خدا میں معلول اور علت کا فرق ختم کر کے کائنات کو خود خدا
کا مظہر قرار دیدیا، اور اس طرح وحدت الوجود کے نظریہ کی تائید کی، یہ دونوں ہی
تصورات قرآنی تصورات سے متصادم تھے جس کے مطابق خدا ایک ارتفاعی اور
انتزاعی وجود ہو کے بھی کائنات میں جاری و ساری تھا، نیز کائنات خدا کے شعوری

ارادہ کا نتیجہ تھی، نہ کہ کوئی غیر شعوری و غیر ارادی صدور، ظاہر ہے کہ دونوں اقسام
کے ساتھ یہ تشریح ان مسلمان حکماء و صوفیا کے لیے جو کہ قرآنی آیات کی صداقت پر
گہرا ایمان رکھتے تھے، اپنی پوری تفصیل کے ساتھ ناقابل قبول تھی، لیکن اسکے باوجود
ایک فلسفیانہ توجیہ کی حیثیت سے قابل غور ضرور تھی، مسلمان حکماء نے اس بات کی
کوشش کی کہ کوئی ایسا فلسفہ ایجاد کیا جائے جو عقل کے بھی مطابق ہو اور قرآنی آیات
کی بھی نفی نہ کرتا ہو، اس کے لیے انھوں نے نوفلاطونی تشریح میں مختلف ترمیم و اضافے
کیے اور اسے قرآن سے مطابقت دینے کی کوشش کی،

فارابی جو ایک منظم اور مربوط فلسفیانہ نظام ترتیب دینے والا پہلا مسلمان
فلسفی ہے، اس نے پہلے پہل اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا، اس نے منطقی اصولوں کی بنیاد
پر موجودات کو واجب الوجود اور ممکن الوجود دو حصوں میں تقسیم کیا، واجب الوجود
وہ شے ہے جس کا تصور ناگزیر طور پر اس کے وجود کا متقاضی ہوتا ہے، جبکہ ممکن الوجود
اشیاء کے تصور کے لیے وجود لازمی نہیں ہے، یعنی یہ کہ ممکن الوجود کو جہاں غیر موجود تصور
کیا جاسکتا ہے، واجب الوجود کے ساتھ ایسا ممکن نہیں ہے، ممکن اشیاء کا وجود چونکہ
مشروط اور اضافی ہے، اس لیے یہ اپنے وجود کے لیے ہمیشہ ایک علت کی محتاج ہوتی
ہیں، اپنی اس علت کے سیاق میں وہ ممکن شے موجود ہوتی ہے، جبکہ فی ذاتہ قطعی ناموجود
فارابی بتاتا ہے کہ اگر ہم کائنات کی تمام اشیاء پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ ہر شے کسی نہ کسی
علت کی معلول اور اس طرح ممکن الوجود ہے، چونکہ تمام اشیاء معلول لیکن پھر بھی
موجود ہیں، اس لیے ان کا بالآخر کوئی نہ کوئی علت اول ہونا چاہیے، علت و معلول
کا سلسلہ پیچھے چلتا ہوا کہیں نہ کہیں رکنا ضرور چاہیے، فارابی کے مطابق وہ ہستی جو کہ

سب سے پہلے موجود تھی، یعنی جہاں علت و معلول کا سلسلہ رک جاتا ہے وہی خدا ہے۔ اسے وہ علت اول، غیر معلول علت، علت العلل یا خدا کا نام دیتا ہے، چونکہ خدا کے وجود کی کوئی علت نہیں ہے اور وہ خود سے موجود ہے اس لیے وہ واجب الوجود ہے۔

تخلیق کے بارے میں فارابی بتاتا ہے کہ یہ خدا کا کوئی غیر ارادی اور طبعی فعل نہیں ہے اور نہ ہی اس معنی میں ارادہ کا نتیجہ ہے، جس معنی میں کہ ہم عام طور پر اسے استعمال کرتے ہیں، خدا کے انسانوں کی طرح ارادہ کرنے کا مطلب اسے محدود کرنا ہے، خدا ہمہ داں اور قادر مطلق ہستی ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ باشعور ہے بلکہ خود شعور بھی ہے، نوفلاطونیت کی مطابقت میں اس نے بھی بتایا کہ خدا نے پہلے خود اپنا علم حاصل کیا اور اس عمل میں علم معلوم اور عالم تینوں ایک ہی تھے، خدا نے جب اپنی ہمہ گیر صفات کا علم حاصل کیا تو اس سے عقل اول کا ظہور ہوا، یہ عقل اول ایک کامل باشعور اور غیر مادی وحدت تھی اور خدا سے براہ راست صادر ہونے کی وجہ سے اس سے اقرب تھی، نیز اس کے علاوہ چونکہ یہ معلول تھی اس لیے فی ذاتہ ممکن اور کثرتوں کی حامل تھی لیکن خدا کے حوالے سے واجب الوجود اور مفرد تھی، عقل اول نے جب اپنی پہلی حیثیت کا اذعان حاصل کیا تو اس سے عقل ثانی کا ظہور ہوا جو کہ اسی کی طرح غیر مادی تھی، لیکن اپنی امکانی حیثیت کے تفکر کے نتیجہ میں فلک اول پیدا ہوا، جو روح اور جسم دونوں پر مشتمل ہے۔ عقل ثانی سے عقل ثالث اور فلک ثانی کا صدور ہوا، اور اس طرح یہ سلسلہ دس عقول اور نو افلاک پر ختم ہوا۔ فارابی دس عقلوں کے سلسلہ کو جو کہ خالص روحانی اور غیر مادی ہیں عالم امر کہتا ہے، اور افلاک کے سلسلہ کو عالم خلق، اسکے مطابق عقل آخر نے فلک آخر کے اتصال سے روح عالم اور مادہ کو جنم دیا، جن کے باہمی

عمل سے عالم محسوس وجود میں آیا،

اوپر کی گفتگو سے واضح ہے کہ فارابی اور دوسرے مسلمان فلاسفہ نے بھی جہاں خدا کے علت عالم ہونے کی حیثیت برقرار رکھی وہیں تخلیق کے لیے کچھ درمیانی واسطوں کو بیچ میں لاکر اس کی وحدت کی حفاظت کی، صوفیا، عام طور پر حکماء کی اس تفریق کو کہ خدا واجب الوجود ہے اور دوسری اشیاء ممکن، صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن خدا اور کائنات کے تعلق کے بارہ میں ایک دوسری تفصیل پیش کرتے ہیں،

شاہ اسمٰعیل شہید (۱۷۷۹-۱۸۳۱) نے اپنی کتاب عبقات میں فلسفہ تصوف کے مختلف مسائل پر بہت اچھی بحث کی ہے جس سے صوفیا کے عام نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ فلسفۂ تصوف کی یہ شاہکار کتاب جہاں ایک طرف مصنف کی عمیق، متوازن اور سلجھی ہوئی فکر کی آئینہ دار ہے، وہیں اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تصوف اپنے اس آخری مرحلہ میں راسخ العقیدگی سے کس قدر قریب ہوگیا تھا، شاہ صاحب کا اساسی اصول جس سے وہ تمام مابعد الطبیعیاتی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ خدا کی قیومیت ہے جو عصر حاضر کے وجودی فلسفہ کے تصور ہستی (Being) سے بہت حد تک مماثل ہے، یعنی وہ شے جو کہ کائنات کی تمام کثرتوں میں پوشیدہ مشترک اور ان کی بنیاد ہے، خدا محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ وہ قیوم کائنات (Sustainer) بھی ہے، یعنی یہ کہ عالم میں جو اشیاء نظر آرہی ہیں انکا قیام خود ان کے وجود پر منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دوسری پس پردہ ذات کے ذریعہ قائم ہیں اور کائنات کی تمام ماہیتیں، ہویتیں اور شخصیتیں اس کے

مظاہر ہیں، خدا ایک مستور جوہر ہے جو اختلافات اور کثرتوں کی بنیاد ہے، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کرسی، میز اور تخت وغیرہ لکڑی سے بنائے جاتے ہیں تو اگرچہ ان کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں لیکن ان کی ذات یعنی لکڑی ایک ہی ہوگی۔ قیوم واحد میں کثرتوں کے ظہور کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"بہرحال اس مثالی تمہید کے بعد سمجھو کہ دنیا میں پیدا ہونے والی ہر شے ایک ترکیبی جوڑے کی حیثیت رکھتی ہے، یعنی اس میں ایک جز تو وہ پائی جاتی ہے جو اپنے وجود میں تو مستقل ہوتی ہے لیکن باوجود مستقل ہونے کے شے میں مستور و پوشیدہ رہتی ہے، یہی شے کا قیوم ہے، اور دوسرا جز اس میں وہ جز موجود تو ہوتا ہے اسی قیوم کے ساتھ اور قیوم کی بدولت لیکن ظاہر و نمایاں اسی کا وجود ہر شے میں ہوتا ہے یہی 'ظل' ہے، پھر جب قیوم پر اظلال کا اژدحام شروع ہوتا ہے اور پہلے پیدا ہونے والے ظل کی پیدائش کی صلاحیتیں جوڑ و نما ہوتی ہیں اور انکی وجہ سے ہوئیتوں کی کثرت کا جو ظہور ہوتا ہے تو اس وقت ایسے امکانی نقوش کے نورانی ہیکلوں کے عجائب بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں جنکے آثار کبھی باہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے جدا بھی ہوتے ہیں، اس وقت ہستی کے اس بحر رحمانی کی سطح پر کوہ پیکر موجیں اٹھ اٹھ کر متلاطم ہونے لگتی ہیں، اور قیوم کے آئینے میں بے شمار صورتیں منطبع ہو ہو کر جلوہ افروز ہونے لگتی ہیں جن میں عجیب و غریب استواری و محکم نشین پائی جاتی ہیں........"

(ص ۴۴-۴۳)

لیکن مندرجہ بالا تحریر سے یہ اشتباہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اس طرح تو خدا اور کائنات ہم موجود قرار پاتے ہیں، اور ان میں تقدم و تاخر یا سبب و نتیجہ کی نسبت باقی نہیں رہتی، مزید یہ کہ اس سے خالق و مخلوق کے درمیان وجودی اتحاد کو نیز موخر الذکر کو اول الذکر کی صفت ماننا پڑے گا۔ پہلے شبہہ کا جواب دیتے ہوئے شاہ صاحب کہتے ہیں کہ جس طرح کرسی یا میز یا تخت اپنی ہیئت میں آنے سے قبل یعنی اپنی اصل ذات میں لکڑی تھی، اسی طرح اشیاء بھی اپنی مختلف صورتوں میں آنے سے قبل خدا تھیں، خدا کو تمام اشیاء پر تقدم حاصل ہے اور وہ ان کی علت ہے، خواہ اسے علت ناقصہ کی حیثیت سے لیا جائے یعنی جیسے بوٹ ٹھنڈک کا سبب ہے یا علت تامہ کی حیثیت سے لیا جائے جیسے کہ خدا تمام علتوں کی علت ہے، دوسرے شبہہ کی توجیہ میں کہتے ہیں کہ کسی چیز کو کسی چیز سے موصوف ہونے میں صرف وجودی اتحاد ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اتحاد خواہ انضمامی ہو یا انتزاعی، اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں کے وجود کا ظرف و موطن بھی ایک ہو، جس طرح ایک آدمی کا ذہن گدھے یا گھوڑے کا تصور کرنے سے گدھے یا گھوڑے کی صفت سے متصف نہیں ہو جاتا، اسی طرح سے اگر خدا کی ذات سے اشیاء متعلق ہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دونوں ایک ہی ہیں،

قیومی وحدت تمام اشیائے کائنات کی خالق اور تمام کثرتوں و اختلافات کا سرچشمہ ہے، اس اعتبار سے صرف اسے ہی دوام و استقلال حاصل ہے اور دوسری چیزیں اسکے سامنے بے حقیقت و بے حیثیت ہیں، کائنات کو جب خدا کے مقابلہ پر رکھ کر دیکھا جائے گا تو یہ قطعی بے حقیقت ہوگی، لیکن جب خواب و خیال سے اس کا موازنہ کیا جائے گا تو یہ عین حقیقت ہوگی، اس کی مثال ایسی ہے کہ جب کوئی شخص خواب دیکھتا ہے تو خواب میں دیکھی جانے والی چیزوں کے بارے میں اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ موجود حقیقی ہیں، حالانکہ وہ چیزیں حقیقی اشیا کے مقابلہ میں جن کا وہ عکس ہوتی ہیں بے حقیقت ہوتی ہیں،

اسی طرح مظاہر عالم بھی اصل حقیقت کا ایک عکس محض ہیں، جنکو کہ ہمارے حواس خمسہ بطور حقیقت کے لیتے ہیں اور ان سے تعلق قائم کرتے ہیں، مزید یہ کہ حالتِ خواب میں اگر کوئی شخص کسی کو یہ بتائے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے وہ فریب نظر یا وہم ہے تو وہ اس کی آواز کو بھی اسی خیالی دنیا کا ایک حصہ سمجھے گا، ٹھیک اسی طرح اس دنیا میں یہ آگاہی کہ دنیا اصل حقیقت کے مقابلہ میں ایک خواب محض ہے، ہمیں اسی واقعاتی دنیا کا ایک حصہ لگتی ہے شاہ صاحب کے مطابق — "حضرت صوفیائے کرام تو یہ فرماتے ہیں کہ عالم کی حیثیت حضرت حق سبحانہ کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے خیالات کی حیثیت خیال کرنے والے کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔" (ص ۵۷)

خالق و مخلوق کے درمیان باہمی تعلق نیز تکوینِ عالم کو سمجھانے کے لئے وہ ایک مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ

فرض کیجئے کہ کوئی ایک حکیم و دانا شخص ہے جو فلاحت و باغبانی و کاشتکاری فنون میں ماہرانہ قابلیت رکھتا ہے، اس کے ساتھ وہ فن تعمیر اور فوجی تربیت نیز آلات حرب کے استعمال کے قواعد و اصول سے بھی واقف ہے، وہ مدنی سیاسیات اور منزلی تدبیر کے اسرار و رموز کا بھی عالم ہے، اور بجائے خود طبیعت میں اسکے لطافت، نزاکت اور نفاست پائی جاتی ہے، ذہن بھی اسکا لطیف و پاکیزہ ہے، وہ ستاروں اور افلاک کی حرکات اور انکے مقامات و منزلوں کو خوب جانتا ہے اور پہچانتا ہے، اب فرض کیجئے کہ ان گوناگوں صلاحیتوں کا حامل حکیم شخص اپنے خیال میں ایک حکومت قائم کرتا ہے، ایسی حکومت جو کہ طویل و عریض ممالک اور علاقوں پر مشتمل ہے، اپنی اس حکومت کے دائرے میں وہ

ان ساری چیزوں کو مہیا کرتا ہے جنھیں اپنے فطری سلیقہ اور کمالات و معلومات کی بنیاد پر فراہم کر سکتا ہے۔ اپنے خیال میں اس طرح کی حکومت قائم کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ یہ آتا ہے جب وہ حکیم ہر چیز سے منقطع ہو کر انتہائی یکسوئی سے اس خیالی سلطنت کے تصور میں کچھ اس طرح سے مستغرق ہو جاتا ہے کہ جو چیزیں اب تک اس کے تحت الشعور میں تھیں، اب وہاں سے نکل کر تفصیلی شعور میں آجاتی ہیں۔ یعنی اس مرحلہ میں اشیاء اس حکیم کی ذات سے غیر اور بطور معروض سامنے آجاتی ہیں۔

خدا کی مثال بھی ایک ایسے ہی حکیم کی طرح ہے اور کائنات اس کا ایک خیال محض ہے جو اس کے لیے اس وقت بطور معروض کے ہو جاتی ہے، جب خدا اسے معقول سے متخیل کرتا ہے، اب جس طرح حکیم اپنے خارجی وجود کے لحاظ سے اپنی تمام مخلوقات اور ان کی صفات سے پاک ہے، اسی طرح حق تعالیٰ کی ذات بھی اپنے مقطورات کے آثار و خواص سے منزہ اور مقدس ہے۔" (ص ۷۵)

اوپر کی گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ صوفیا کے یہاں کائنات کی حیثیت خدا کی ذات کے مقابلہ میں ایک خواب سے زیادہ کی نہیں ہے، کائنات کا یہ تصور شنکر کے ویدانتی تصور کائنات سے بہت زیادہ قریب ہے، شنکر بھی عالم کو "مایا" کہکر اس کی بے حقیقتی پر زور دیتا ہے، اور اس کی نفی کرتا ہے، اس کے مطابق حقیقت الحقائق ایک مطلق ذات ہے، جو تمام صفات سے مبرا نیز خالص وحدت ہے۔ یہ ذات جس کو وہ برہم کا نام دیتا ہے، کثرتوں اور تنوعات سے قطعی عاری ہے، ایسا نہیں ہے کہ کثرتیں ذات مطلق کی مخلوق ہیں بلکہ یہ کہ وہ قطعاً غیر موجود ہیں، یہ ہمارا جہل یا عدم علم ہے جو ان کے ادعا کے لیے ہمیں مجبور کرتا ہے، ایک ایسا شخص جو عرفان کی دولت سے

مالامال ہے، وہ کبھی طبیعی دنیا کی کثرتوں کا اقرار نہیں کرسکتا طبیعی دنیا کی بذاتہ حقیقت میں یقین رکھنے والے کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اندھیرے میں چلا جا رہا ہو اور کسی پڑی ہوئی رسی کو سانپ سمجھ بیٹھے، دنیا کی ظاہری حقیقت رسی کے بظاہر سانپ معلوم ہونے سے زیادہ نہیں ہے، جس طرح سے روشنی ہوتے ہی شخص پر حقیقت عیاں ہو جاتی ہے اسی طرح سے عرفانِ ذات ہونے پر عارف کے اوپر کائنات کی بے حقیقتی عیاں ہو جاتی ہے،

عموماً یہ اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ کائنات کو محض خوابِ خیال قرار دینا ایک ایسی بات ہے جسے وجدان کبھی قبول نہیں کرسکتا، اشیائے عالم کا ٹھوس، مرئی اور منفرد ہونا ہمیں ہر وقت ان کو حقیقی سمجھنے کے لیے مجبور کرتا ہے، مگر کیا واقعی یہ اشیاء ویسی ہی ٹھوس اور حقیقی ہیں، جیسا کہ ہم انھیں فہم عام کے ذریعہ سمجھتے ہیں، کیا اشیائے عالم کی مادی و حقیقی نوعیت کا انکار صوفیا نے ہی کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی مابعد الطبیعی تحلیل خواہ فلسفیانہ اعتبار سے کریں خواہ سائنسی اعتبار سے، ہم بہرحال اسی نتیجہ تک پہونچیں گے کہ جن چیزوں کو ہم موجود اور حقیقی سمجھتے ہیں، وہ فی الاصل غیر موجود و غیر حقیقی ہیں،

یورپ کی فلسفیانہ تاریخ میں زمانہ قدیم سے لیکر آجتک فلاسفہ کی ایک عظیم اکثریت عالم ظاہری کی حقیقت کی کسی نہ کسی شکل میں منکر رہی ہے، بالکل ابتدائی یونانی حکما مثلاً تھیلس اور انکسیمنز وغیرہ اگرچہ حقیقت کو مادی مانتے تھے، تاہم کائنات اپنی ظاہری شکل میں حقیقت ان کے نزدیک بھی نہیں تھی، پارمینائڈ نے اصل حقیقت استقلال کو مانا اور تمام ظاہری تبدیلیوں اور حرکات کا انکار کیا، اس کے برعکس ہیراقلیطس نے استقلال کو فریب نظر اور تبدیلی کو اصل حقیقت سمجھا، لیکن جو بات ان دونوں حکما میں مشترک رہی وہ کائنات کی شہودی اور ظاہری حیثیت کا انکار تھا، افلاطون نے عالم طبیعی کو ایک غیر مرئی اور

ماورائی عالم کا عکس بتا کر کائنات کی حقیقی توجیہ کو سب سے بڑی ضرب پہنچائی، اور ایک اعتبار سے بعد کے زمانہ کی بہت سی صوفیانہ تحریکوں کا سرچشمۂ فیضان بن گیا، عہد جدید کے فلسفہ میں اسپنوزا، لائبنز، ہیگل وغیرہ تمام اہم فلاسفہ کسی نہ کسی صورت میں حقیقی فلسفہ کے مخالف رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدائی دو تین دہائیوں کو چھوڑ کر جس میں کہ سائنس کے زیر اثر مختلف فلسفیانہ مکاتب فکر نے حقیقت Realism بحیثیت تصور حقیقت اختیار کیا، فلسفہ میں عمومی روایت مخالفت حقیقیت رہی ہے، لیکن یہ فلسفہ بھی اب اپنا اثر کھو چکا ہے، موجودہ زمانہ میں جو تحریکیں فلسفہ میں برسر عروج ہیں مثلاً لسانی تحلیل اور وجودیت دونوں ہی مابعد الطبیعیات کی مخالف ہیں، اس لیے ان کے یہاں فلسفہ حقیقیت کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے،

امریکہ اور انگلینڈ جہاں کہ حقیقیت کا زیادہ چرچا رہا وہاں اس فلسفہ کے زوال کی سب سے بڑی وجہ کچھ اور نہیں بلکہ خود سائنس ہی تھی، ایک اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایتی ایٹمی طبیعیات بھی کائنات کے حقیقی تصور سے متناقض تھی، کیونکہ یہ عالم کو ایسے ذرات کی اصطلاح میں توجیہہ کرتی تھی جو کہ اپنی نوعیت اور تعریف کے اعتبار سے غیر مرئی اور ناقابل تحلیل تھے، اس سائنس کی روشنی میں عالم کو اس کی ظاہری حیثیت میں ہم بحیثیت حقیقت نہیں لے سکتے تھے، بایں ہمہ حقیقیت کو سب سے بڑا دھکا اس وقت پہنچا جب کہ آئن اسٹائن نے نظریۂ اضافیت کی ایجاد کر کے طبیعیات میں انقلاب پیدا کر دیا، کائنات اپنی انتہائی تشکیل کے اعتبار سے مادہ نہ رہی بلکہ مادہ کا تصور توانائی کے تصور کے ذریعہ بدل دیا گیا اس نئے طبیعیاتی نظریہ کی روشنی میں کائنات کو اس کی ظاہری حیثیت میں حقیقی ماننا محال ہے، اشیا مادی نہ تو ٹھوس ہیں اور نہ ہی جسیم، کائنات میں علت و معلول

کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، معروضی اور مطلق زمان و مکان محض ہماری ذہنی اختراعات
ہیں، مختصر یہ کہ عالم شہود محض ایک فریب نظر اور حواس کا دھوکہ ہے،

کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سائنس کی یہ نئی ایجاد ہمارے مذہبی یا متصوفانہ تصورِ
کائنات کی پوری طرح مصدق ہے، قابل ذکر بات صرف اتنی ہے کہ اگر صوفیا نے اپنی فکر
کے ذریعہ عالم شہود کی بے حقیقتی پر زور دیا تو وہ ایسا کرنے میں منفرد تھے، سچی بات یہ ہے کہ
کائنات کو اس کی آخری مابعد الطبیعی نوعیت کے اعتبار سے غیر حقیقی ماننا اور اس سے
اعراض و قطع تعلق کرنا دو مختلف چیزیں ہیں، مابعد الطبیعی غیر حقیقیت، فلسفہ، سائنس اور
تصوف کی تمام تحریکوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، جو بات ان میں تمیز پیدا کرتی
ہے وہ ماننے والے کا عملی رویہ ہے۔ کیا وہ کائنات کو مطلق غیر حقیقی سمجھ کر اپنے اندر انفعالیت
اور رہبانیت کو پرورش دیتا ہے جیسا کہ ہندو اور نوفلاطونی تصوف میں ہم دیکھتے ہیں،
یا اس کے برعکس کائنات کی مطلق ناقابل فہم نوعیت انسان کو زیادہ سے زیادہ لذات
اور مسرتیں حاصل کرنے کی طرف راغب کرتی ہے اور انسان تمام اخلاقی حدود و قیود کا
انکار کر بیٹھتا ہے، جیسا کہ مغرب کی معاصر تہذیب میں ہم پاتے ہیں، یا پھر یہ کہ انسان ایک
معتدل نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے، یعنی یہ کہ وہ کائنات کو اصل حقیقت کے مقابلہ میں بے حقیقت
سمجھتے ہوئے بھی عملاً اس سے تعلق قائم کرے اور اس کی تہذیب و اصلاح کے لیے جد و جہد
کرے، جیسا کہ بیشتر مسلمان صوفیا کا رویہ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تصوف کا نقطۂ امتیاز یہی رہا ہے کہ وہ رہبانیت
(Asceticism) اور لذت پرستی (Hedonism) کی انتہا پسندی کے درمیان
اعتدال پیدا کرتا ہے، ایک طرف تو وہ حقیقت الحقائق خدا کی ذات کو بنا کر عالم کی

اضافی ناحقیقتی پر زور دیتا ہے تو دوسری طرف رہبانیت کی سختی سے تردید کرتا ہے، نیز انسان
میں ایجابی رجحانات کی پرورش کرتا ہے، عام صوفیا کی زندگی ان کے نظریہ کی بہترین ترجمان ہے
مثال کے طور پر اگر ہم شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی زندگی کو ہی لیں تو دیکھیں گے کہ ان کی زندگی میں
عملیت اور حرکیت بدرجہ اتم تھی، ان کی زندگی کا بیشتر شعوری حصہ اسی فکر میں گذرا کہ
عملی جد و جہد کے ذریعہ کس طرح دکھی انسانیت کی نجات کا سامان کیا جائے، بحیثیت ایک
مومن کے ان کا عقیدہ تھا کہ محض اسلامی شریعت کی ترویج و نفاذ کے ذریعہ ہی ایک
ایسا سماجی ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکتا ہے جس میں کہ افراد تمام مادی راحتیں حاصل کر سکیں
اور اپنے روحانی ارتقا کی طرف متوجہ ہو سکیں، چنانچہ ان کی زندگی کا خاتمہ میدان جنگ
میں ہوا نہ کہ خانقاہ میں جو کہ غالباً عملیت کا ایک کامل ترین اظہار ہے،

اس کے علاوہ اس مسئلہ کا ایک نظری پہلو بھی ہے جسے ذہن میں رکھنا چاہیے، فرض
کیجئے ایک شخص کچھ خیالی مخلوقات تصور کرتا ہے، نیز یہ بھی فرض کیجئے کہ وہ خیالی مخلوقات
فہم و فراست کی بھی حامل ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں، اب ظاہر ہے
کہ بحیثیت باشعور مخلوقات کے ان کی سمجھ میں کبھی نہیں آئیگا کہ وہ کسی خیال کرنے والے
کا خیالِ محض ہیں اور ان کی اپنی کوئی خودمختار حیثیت نہیں ہے، یہی معاملہ انسان
کے ساتھ بھی ہے کہ اگرچہ وہ ایک ذہن مطلق کا خیال محض ہیں، لیکن چونکہ باشعور ہیں
اس لیے خود کو کاملاً حقیقی و موجود سمجھتے ہیں، مخلوقات کی ناحقیقتی محض خالق کے
سیاق و تعلق میں ہوتی ہے ورنہ غیر موجودات کے مقابلہ میں وہ عین حقیقی ہوتی ہیں،
صوفیا کا عالم کی بے حقیقتی پر اصرار بھی در اصل اسی معنی میں تھا، انھوں نے مطلق نفی
کبھی نہیں کی، شنکر بھی عالم کی جو نفی کرتا ہے وہ خدا کے مقابلہ پر رکھ کر نہ کہ بالذات

وہ کہتا ہے کہ عالم ناممکنات مثلاً "بانجھ عورت کی اولاد" یا "گدھے کی سینگ" وغیرہ کے مقابلہ میں عین حقیقی ہے،

خدا اور کائنات کے درمیان تعلق کی مندرجہ بالا تشریح سے وہ بحث بھی کسی حد تک سلجھ جاتی ہے جو کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کے ماننے والوں میں چلی آرہی ہے۔ اول الذکر نظریہ جس کے بانی اسلامی تاریخ میں شیخ اکبر محی الدین ابن العربی ہیں کے مطابق وجود صرف خدا کا ہے اور تمام غیر اشیا غیر موجود یا عدم ہیں، اس کے برخلاف شیخ احمد سرہندیؒ کا نظریہ وحدت الشہود خدا کی انتزاعیت اور کائنات سے تفریق پر اصرار کرتا ہے۔ اس کے مطابق اگر کثرتوں اور تنوعات کی اصل نیستی ہیں تاہم وہ خدا کی ذات وصفات سے منور ہیں، اور اس لیے ان میں ہستی کا ایک عنصر ہے،

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے یہ دونوں نظریے بالعموم ایک دوسرے کے متضاد اور مخالف سمجھے جاتے ہیں، اور ایک زمانے تک صوفیا میں ان میں سے کسی ایک کو اختیار اور دوسرے کا ابطال کرنے کا رجحان رہا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب التطبیق بین الوجود والشہود اور پھر شاہ اسمٰعیل شہید نے عبقات میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں ہی دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں اور ان میں نزاع واختلاف محض لفظی ہے، مثلاً شاہ اسمٰعیل شہید لکھتے ہیں:۔

اس گروہ (قائلین وحدت الوجود) اور ان لوگوں میں جو شہودیہ ظلیہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان دونوں میں تحقیقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کسی قسم کا واقعی اختلاف نظر نہیں آتا، البتہ صوفیا کے ان دونوں طبقات سے جن لوگوں کا تعلق ہے چونکہ ان کے مقامات مختلف ہیں اور "لاہوت" (خدا) تک پہنچنے میں راہوں کا جو اختلاف ہے

اس کی وجہ سے دونوں تعبیروں میں اختلاف ضرور پیدا ہوگیا ہے، لیکن یہ تعبیروں کا اختلاف ہے نہ کہ واقعہ اور حقیقت کا۔ مطلب یہ ہے کہ ان میں کچھ حضرات تو ایسے ہیں جنکی نظر لاہوت میں کچھ اس طرح ڈوب جاتی ہے کہ عالم (خدا کے سوا جو کچھ ہے) سب ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، وہ اس ذات کے جلال وجمال کے مشاہدہ میں مستغرق ہو جاتے ہیں، جس کے سوا انھیں دوسری کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی اور ان کا یہ حال ایسا ہی ہے کہ اس کے بعد اگر وہ یہ کہتے ہوئے چیخ اٹھیں کہ ہستی کے اس دائرے میں خدا کے سوا کچھ بھی نہیں تو اپنے حال کے مطابق ان کو یہ کہنے کا حق ہے، انکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ لاہوت ہی سب کچھ ہے اور وہی ہر چیز کا عین ہے یا وہی ہر چیز ہے بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی غیر کا یہاں نام ونشان ہی نہیں پایا جاتا....

....لیکن ان ہی کے مقابلہ میں دوسرا طبقہ ان لوگوں کا بھی ہے جن کے سینوں کو خدا کھول دیتا ہے، نظر میں ان کے وسعت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کائناتی کثرتوں کا احساس لاہوت (یعنی حق تعالیٰ) کی ذات میں استغراق وانہماک کا جو حال ان کو میسر آتا ہے اس حال میں مزاحم نہیں ہوتا بلکہ ان ساری کثرتوں کو وہ حق تعالےٰ ہی کے کمال کی تفصیل قرار دیتے ہیں اور ان کثرتوں کے آئینہ میں ہی اپنے محبوب کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔" ص ۸۶-۸۵)

کائناتی کثرتوں کے ہوتے ہوئے بھی اگر شیخ اکبر نے وجود کو واحد قرار دیا تو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مطابق اس کی مثال ایسی ہو کہ ہم زید کو تنہا ذات قرار دیتے ہیں حالانکہ اسکے ذہن وخیال میں کثیر ومتعدد اشیاء وتصورات ہیں، یعنی جس طرح تصورات کی کثرت زید کی وجودی وحدت کو متاثر نہیں کرتی اسی طرح اشیائے کائنات کا تعدد ذات باری

کی وجودی وحدت کی نفی نہیں کرتا، شیخ اکبر نے واقعہ کے اس پہلو پر زور دیا کہ عالم میں جو کچھ ہے سب کا احاطہ لاہوت کیے ہوئے ہے اور کائنات کی کثرتیں ذاتِ حق سے لاینفک طور پر قیود میں کچے رشتہ میں بندھی ہوئی ہیں، لیکن اسکے برخلاف شیخ مجدد سرہندیؒ نے جو خدا کی ارتفاعیت اور تنزیہہ پر زور دیا تو اسکا سبب یہ تھا کہ ان کے دل و دماغ لاہوت کی عظمتؒ جلال سے معمور تھے، لاہوت میں اور کائنات کی کثرتوں میں موطن وظرف وجود کا جو فرق ہے اسکا احساس ان پر کچھ اس طرح مسلط اور مستولی تھا، خالق و مخلوق میں مغائرت کا تعلق انکو اتنا گہرا نظر آیا جس کی انکے نزدیک کوئی حد تھی نہ انتہا، انھوں نے پایا کہ لاہوت کے سامنے کائنات کی ان کثرتوں کی نہ کوئی حیثیت ہے نہ قیمت، اور اسکے مقابلہ میں انھوں نے لاہوت کے وجود کو سب سے بے نیاز اور مستغنی پایا۔ ....

اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالق و مخلوق کے وجود میں اتحاد کا جو رشتہ و تعلق پایا جاتا ہے، اس پہلو کی تفصیل و تشریح میں انھوں نے اجمال سے کام لیا اور مغائرت کی نسبت کی تعبیر و تشریح کو اپنا نصب العین بنایا" (ص ۸۷)

شیخ اکبر اور مجدد سرہندی کے درمیان تضاد و مخالفت کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جہاں شیخ اکبر نے بعض تحریروں (مثلاً فتوحات مکیہ کے ابتدائی ابواب میں) بہت واضح الفاظ میں ذات باری کو اشیائے عالم کی کثرتوں اور تنوعات سے پاک و منزہ قرار دیا ہے، نیز اول الذکر کے موخر الذکر سے انصاف کی سختی سے مخالفت کی ہے وہیں مجدد سرہندی کی بھی کچھ تحریریں ایسی ہیں جن سے شیخ اکبر کے مسلک کی تائید ہوتی، حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے تصور توحید میں بگاڑ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم مظاہر کائنات کو اس کی ظاہری حیثیت میں نیز اس کے تغیر و تبدل کو خدا میں تغیر و تبدل تصور کرنے لگتے ہیں۔

باب التقریظ والانتقاد

سید احمد شہیدؒ

ہز لائف اینڈ مشن

سید احمد شہیدؒ۔ ہز لائف اینڈ مشن (انگریزی) مصنفہ محی الدین احمد کتابت و طباعت عمدہ، ضخامت ۴۲۰ صفحے ناشر اکیڈمی اف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز، لکھنو، قیمت۔ چالیس روپیے۔

جناب محی الدین احمد کے نام سے وہ علمی حلقہ اب اچھی طرح واقف ہوچکا ہے، جس کو اسلامیات اور لکھنو کے ادارۂ تحقیقات و نشریات اسلام کی مطبوعات سے دلچسپی ہے، وہ اس ادارہ کے بہت ہی لائق، سرگرم اور ہونہار رکن ہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی مشہور تصنیف تاریخ دعوت و عزیمت کی دو جلدوں نیز مذہب اور تمدن، مسلمان اور معرکۂ مذہب و مادیت کے انگریزی ترجمے کرکے انگریزی زبان لکھنے کی مہارت کا ثبوت دے چکے ہیں، وہ لکھنؤ سکریٹریٹ کے ایک سرکاری عہدیدار ہیں، اگر کسی یونیورسٹی میں ہوتے تو ان کی شہرت اب تک بہت پھیل چکی ہوتی، ان کو سرکاری دفتر کے کام کی الجھنوں سے جو بھی وقت ملتا ہے لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے ہیں، جو قلمی جہاد سے کم نہیں وہ اسلام اور اسلامی تحریکوں سے بڑا شغف رکھتے ہیں، اسی لیے ان کا قلم ان ہی موضوعات پر بڑا رواں دواں ہوجاتا ہے، مولانا ابوالحسن علی ندوی سے ان کو محبت ہی نہیں بلکہ بڑی فریفتگی ہے، ان ہی کی صحبت میں نہ صرف علمی تربیت بلکہ ذوق کی پاکیزگی، اور تحریر کی سلاست روی حاصل کی، ان ہی کی وجہ سے

ان کو سید احمد شہید بریلویؒ سے عقیدت پیدا ہوئی۔ مولانا ے موصوف کی تصنیف سیرت سید احمد شہیدؒ بریلوی بہت مقبول ہے، جس میں اس بطل حریت اسلام کے کارناموں سے متعلق پہلی دفعہ مفید تفصیلات پیش کی گئی تھیں، اس کی اشاعت کے بعد ان پر اور کتابیں بھی نکلیں، محی الدین صاحب چاہتے تو مولانا کی اس تصنیف کا بھی ترجمہ انگریزی میں بہت آسانی سے کر سکتے تھے، مگر ان کو اسلام کے اس سر فروش اور کفن بردوش غازی سے کچھ ایسی غیر معمولی عقیدت ہوئی کہ انگریزی میں ایک علیحدہ مستقل کتاب لکھ کر اپنی علمی اور تحقیقی تشنگی بجھائی، اس کتاب میں وہ سب کچھ ملے گا جو اب تک سید احمد شہیدؒ پر لکھا جا چکا ہے، اور وہ بھی ملے گا جو اب تک ان پر نہیں لکھا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ انگریزی میں ان پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی، انگریزی داں حلقہ اس کو پڑھ کر نہ صرف اس شیر دل مجاہد اسلام کے دلیرانہ کارناموں، مبلغانہ کاوشوں اور مخلصانہ مذہبی سرگرمیوں سے پورے طور پر واقف ہوگا، بلکہ اگر قارئین میں سے کوئی اسلامی حمیت رکھتا ہوگا تو وہ اس کے مصنف کے لیے دلی دعائیں بھی دے گا،

کتاب کے شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا ایک بہت ہی پر مغز مقدمہ ہے، اس میں ان انگریز مصنفوں کی ان مفسدانہ غلط بیانیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جو وہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے متعلق کرتے رہے ہیں، اس کے بعد کتاب میں حسب ذیل ابواب ہیں (۱) اٹھارہویں صدی میں مسلم انڈیا، (۲) سید احمد شہیدؒ کے آباؤ اجداد اور ان کی ابتدائی زندگی، (۳) راہ طریقت کا سالک (۴) نواب امیر خان کے یہاں قیام (۵) خادم خدا (۶) حج (۷) جہاد کا تخیل (۸) سکھوں کا عروج (۹) رائے بریلی سے نوشہرہ تک (۱۰) امیر المومنین کا انتخاب، (۱۱) عظیم فریب

(۱۲) پنجتار اور ہکر، (۱۳) شریعت کا نفاذ، (۱۴) زیدہ کی جنگ (۱۵) ہزارہ کی جنگی سرگرمیاں (۱۶) پشاور پر قبضہ (۱۷) خوفناک سازش (۱۸) بالاکوٹ (۱۹) غریب الوطن مجاہدین (۲۰) علی برادران (۲۱) مولانا عبداللہ (۲۲) ابتلاء آزمائش اور مصائب (۲۳) کردار اور کارنامے، ان ابواب کے علاوہ ایک ضمیمہ میں سید احمد شہید بریلویؒ کے ایک خط کا انگریزی ترجمہ ہے،

اس کتاب کا آٹھواں باب اس لحاظ سے پڑھنے کے لائق ہے، کہ اب تک ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یہ زبردست قلمی مہم جاری ہے کہ انھوں نے اپنے مذہبی تعصب میں مندروں کی بے حرمتی کرکے ان کو منہدم کیا، جس کو پڑھ کر ہندوؤں میں بڑا اشتعال پیدا ہوتا ہے، مگر لائق مصنف نے کنھیا لال، میلکم، اور مائیکل ایڈورڈ کی تاریخوں سے یہ دکھایا ہے کہ سکھوں نے اپنے دور حکومت میں کس طرح پنجاب کی مسجدوں کی بے حرمتی کی، وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رواداری کے معترف ہیں، مگر انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ اس کے عہد حکومت میں ہزاروں مسجدیں منہدم کرکے ان کی جگہوں پر سکونتی مکانات بنا لیے گئے، روشن الدولہ ظفر خان کی بنائی ہوئی سنہری مسجد پر قبضہ کرکے وہاں ادی گرنتھ رکھی جانے لگی، وہاں سے ملا نکال دیے گئے، اس کے فرش کو گوبر سے لیپا گیا، اس کی ملحق دوکانوں پر گردوارے کا قبضہ ہو گیا، مؤذن کو اذان دینے سے روک دیا گیا، (ص ۱۴۹) لاہور کی بادشاہی مسجد فن تعمیرات کے لحاظ سے مشہور ہے، اس کی بھی بے حرمتی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی، اس کے اندر لاکھوں روپیے کی قندیلیں لٹکی رہتیں، قیمتی قالین بچھے رہتے، لیکن سکھوں نے اس پر قبضہ کرکے اس کو لشکر گاہ توپ خانہ اور بارود خانہ میں منتقل کر دیا، فرش پر جو قیمتی پتھر بچھے ہوئے تھے

وہ بھی اکھاڑے گئے، مستی دروازہ پر جو مسجد تھی، وہ بارود تیار کرنے کی ایک فیکٹری
بنا دی گئی، سکھوں کو مسلمانوں کی طرح ٹوپی اور لباس پہننے کو بھی روکا گیا (ص ۱۴۹) سکھوں
ہی میں سے بندا نے سنہ ۱۷۰۸ء میں سرہند پر قبضہ کیا، تو اس کے حاکم کو قتل کر دیا، چار دن
یہ شہر لوٹا جاتا رہا، اس لوٹ میں ہر قسم کی سفاکی سے مسجدوں کی بے حرمتی اور عورتوں
کی آبرو ریزی کی گئی، عام مسلمان تہ تیغ کیے گئے، (ص ۱۳۶) خود مہاراجہ رنجیت سنگھ
نے اپنی موجودگی میں پشاور کی مسجدوں کی بے حرمتی کرائی (ص ۱۰۵) اس طرح کے اور
بھی واقعات تاریخ میں ملتے ہیں، ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں غیر مسلموں کی طرف
سے بھی مسجدیں شہید ہوتی رہیں، سنہ ۱۹۴۷ء کے خونریز ہنگاموں میں دہلی سے مشرقی پنجاب
کی آخری سرحد تک معلوم نہیں کتنی مسجدیں شہید کی گئیں، کتنی مویشی خانہ بنا دی گئیں،
اور کتنی سکونتی مکانات میں منتقل کر دی گئیں، حکومت کی کوششوں کے باوجود ان کی
واگذاشت ابھی تک نہیں ہو سکی ہے، اگر ان کی تفصیلات اسی انداز میں لکھی جائیں
جس میں مسلمان حکمرانوں کے عہد کے مندروں کے انہدام کی تفصیلات لکھی جا رہی
ہیں تو نہ صرف محمود غزنوی اور اورنگزیب کی مندر شکنی کے جھوٹے سچے افسانے
بھلا دیے جائیں بلکہ غیر مسلم مورخوں کی فرقہ دارانہ قلمی مہم میں اس لحاظ سے کمی آجائے کہ خود
غیر مسلموں کا دامن اس سلسلہ میں پاک نہیں، بلکہ بہت زیادہ آلودہ ہے،

سکھوں نے بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی لاش کی جو بے حرمتی کی وہ بھی
انتہائی تکلیف دہ کہانی ہے، شیر سنگھ نے تو اسکو دفن کرا دیا، لیکن ونہاں سنگھ اور لکھا سنگھ کھمبیر
نے اور دوسرے سکھوں سے مل کر لاش کو قبر سے باہر نکالا، اس کو ٹکڑے ٹکڑے
کیا پھر دریا میں پھینک دیا، (ص ۳۸۶) ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے

عہد میں ایسی سفاکی کی مثال مشکل سے ملے گی، سکھوں نے یہ سب کچھ اپنی تھوڑی سی مدت
کی حکومت میں کر ڈالا، مسلمان حکمرانوں کو چھ سو سال سے زیادہ حکمرانی کا موقع ملا، اس
طویل مدت میں ان کے یہاں ایسی سفاکانہ مثالیں اگر مل بھی جائیں تو ان کی حکومت
کی مدت کی طوالت سے زیادہ قابل التفات نہیں، زیر نظر کتاب کے مرتب کوئی پرانے
اور جانے بوجھے مورخ نہیں، لیکن انھوں نے تاریخی واقعات کی ترتیب، تنظیم، چھان بین
اور نتائج کے استنباط میں مورخانہ دیدہ وری دکھائی ہے، ۲۳ ویں باب میں حضرت
سید احمد شہیدؒ کے کردار اور کارناموں پر جو تبصرہ کیا ہے، وہ بہت ہی مدلل ہے، انکی
زندگی اس حیثیت سے ایک مثالی نمونہ ہے، کہ ہر قسم کی بے سروسامانیوں مالی پریشانیوں
اور سیاسی مشکلوں کے باوجود محض دینی غیرت ملی حمیت اور ایمانی بصیرت کی بدولت
مسلمانوں کے جمود کو ختم کر کے ان کی زندگی کو متحرک اور فعال بنا دیا، انھوں نے
رائے بریلی سے پشاور تک اپنے اردگرد کے لوگوں میں سپہگری، جان نثاری اور
سرفروشی کا جو جذبہ پیدا کیا، وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے شمع راہ ہے، وہ کوئی
باضابطہ تربیت یافتہ فوجی سپہ سالار نہ تھے، اور نہ ان کے مقلدوں کو کوئی حربی
تجربہ تھا، لیکن انھوں نے مختلف لڑائیاں لڑ کر وہ سارے اوصاف دکھائے
جو آزمودہ کار اور تربیت یافتہ فوجی دکھا سکتے تھے، ان کی صحبت میں تربیت پاکر
شاہ اسمٰعیل شہیدؒ مولوی ولایت علی، مولوی عنایت علی، اور مولوی یحییٰ علی وغیرہ نے
جو سیرت اور کردار کے نمونے پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کی زندگی کے لیے گوہر شب
چراغ بن کر رہیں گے، حضرت سید احمد شہیدؒ کی شہادت کے بعد ان کے مقلدوں نے
ہندوستان میں انگریزوں کی سامراجی قوت سے ٹکر لینے میں جو سرفروشی دکھائی

وہ بھی زریں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے، زیر نظر کتاب کا بائیسواں باب اسی سرفروشانہ جہاد کی بڑی جیتی جاگتی تصویر ہے،

حضرت سید احمد شہیدؒ کو بالاکوٹ میں شکست ضرور ہوئی، مگر مسلمانوں کی یہ تاریخ ہی ہے کہ ہر کربلا کے بعد اسلام زندہ ہوتا ہے، بالاکوٹ بھی ہندوستانی مسلمانوں کا ایک کربلا تھا، لیکن حضرت سید احمد شہید بریلویؒ نے اپنی مجاہدانہ تحریک سے ہندوستانی مسلمانوں کی جامد زندگی میں جو روح پھونکی، اس سے قال اللہ اور قال الرسول کی صدا ایسی گونجتی رہی کہ انگریزوں نے اپنی جابرانہ اور قاہرانہ قوت سے مسلمانوں کے تاج و تخت پر تو قبضہ کر لیا، مگر وہ اپنے دور حکومت میں مسلمانوں کے دل و دماغ کی تسخیر نہ کر سکے، یہ روح کیسے پیدا ہوئی اس کی پرکیف داستان زیر نظر کتاب میں ملے گی،

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں بالاکوٹ کی شکست ایک بہت بڑا المیہ ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ کی مجاہدانہ مہم میں جہاں ایسے ہزاروں مجاہدین شریک ہوئے تھے، جو صحابۂ کرام کے نقش قدم پر چل کر ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئی زندگی عطا کرنے والے تھے، وہاں اس میں یار محمد خاں، سلطان محمد خاں اور فتح خاں وغیرہ جیسے آستین کے سانپ بھی شریک ہوئے، اگر وہ غداری، ایمان فروشی اور خود پرستی کے بجائے حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے اور جان نثاروں کی طرح پاک باطنی، روشن ضمیری اور وفاداری کا حق ادا کرتے تو ہندستان کے مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی، اس کتاب میں ان غداروں کی منافقانہ کارروائیوں کی بھی پوری سرگذشت ملے گی،

اردو میں حضرت سید احمد شہید بریلوی پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا غلام رسول مہر کی دو اچھی کتابیں پہلے بھی نکل چکی ہیں جن میں ان کی زندگی اور کارنامے کی پوری تفصیل ہے، پھر بھی محی الدین احمد صاحب کی کتاب پڑھنے میں ایسی ہی روح کے بجائے تازگی محسوس ہوگی، اس میں ان کے

انداز بیان اور تحقیقی کاوش کو بڑا دخل ہے، امید کہ یہ کتاب علمی حلقہ میں شوق سے پڑھی جائیگی،

لائق مصنف کی کتاب میں جابجا انگریزوں کی تصانیف کے بھی حوالے ہیں میری ذاتی رائے ہے کہ یورپی اور امریکی مصنفوں کی کتابوں کو بالکل ہی نظر انداز کرنے کی مہم چلائی جائے، خواہ ان کی تحریر اسلام اور مسلمانوں کی حمایت ہی میں کیوں نہ ہو ان کی کسی اچھی رائے کو بھی قابل اعتنا قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی مخالفانہ اور معاندانہ رائے کی اہمیت غیر شعوری طور پر بڑھ جاتی ہے زیر نظر کتاب کے ص ۹ پر لوتھروپ اسٹوڈرڈ کی کتاب دی نیو ورلڈ آف اسلام سے جو اقتباس دیا گیا ہے وہ اس اچھی کتاب میں نہ ہوتا تو اچھا تھا، خود لائق مؤلف اٹھارہویں صدی کے اسلام کی زبون حالی کی تفصیل اپنے ہی قلم سے پیش کر سکتے تھے، ولفرڈ کینٹول اسمتھ کی تحریروں کو بھی اہمیت نہیں دینی چاہئے تھی، وہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے کچھ تعریفی کلمات لکھ کر ان کی برائی بیان کرنے میں اپنے قلم اور تحقیق کی مہارت دکھاتا ہے، ہیلکم، مل، ولسن، گرینڈ ڈف، کننگھم، ولیم ہنٹر ہوں یا مشہور مستشرقین سب کو نظر انداز کرکے ان کو احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ اب مسلمانوں کی نظروں میں اپنی بددیانتی اور علمی فتنہ پردازی سے اتنے بدنام ہو چکے ہیں، کہ ان کی کتابیں اور تحریریں مسلمانوں کے حلقہ میں قابل وقعت نہیں سمجھی جانے لگی ہیں،

کتاب میں طباعت کی کچھ ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں، جو اس عمدہ کتاب کیلئے بالکل نامناسب ہیں، مثلاً بعض الفاظ اس طرح چھپ گئے ہیں، کہ غزنی کو گزنی (ص ۲۴۴) نفیر کو نکیر (ص ۱۴۸) قافلہ کو کافلہ (ص ۱۳۱) مولوی غفار کو مولوی گفار پڑھا جاتا ہے، امید کہ اس کے دوسرے اڈیشن میں طباعت کی یہ فروگذاشتیں درست کر دی جائیں گی،

(ص ۔ع)

مطبوعاتِ جدیدہ

محاسن موضح القرآن۔ مرتبہ مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی تقطیع متوسط کاغذ معمولی کتابت قدرے بہتر صفحات ۸۰۔ قیمت تحریر نہیں پتہ ادارہ رحمت عالم شیخ چاند اسٹریٹ لال کنواں، دہلی،

حضرت شاہ عبد القادر دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، لیکن یہ ڈیڑھ سو سال پہلے کا ہے، اس طویل عرصہ میں کتابت و طباعت کی غلطیوں کے علاوہ ناشروں نے بھی خاصا تصرف کر دیا ہے، نیز اب اردو کا اسلوب بہت کچھ بدل گیا ہے، اور بعض الفاظ اور ترکیبیں متروک ہو چکی ہیں، اسلئے پہلے بھی بعض اہل علم شاہ صاحب کے ترجمہ و فوائد کے مشکل لفظوں کی تشریح کر چکے ہیں، اب مولانا اخلاق حسین قاسمی نے بھی ترجمہ و فوائد کا ایک صحیح نسخہ مرتب کیا ہے، جس کو آئندہ شائع کریں گے، زیر نظر رسالہ میں قدیم و جدید اڈیشنوں کی طباعتی غلطیوں اور ناشروں کے تصرفات کی نشاندہی کر کے اصل ترجمہ کے محاسن دکھائے ہیں، اس سے مصنف کی محنت و عرق ریزی کا اندازہ ہوتا ہے، خدا کرے موضح القرآن جلد شائع ہو،

مسیحیت۔ مترجمہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت۔ عـہ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔

اردو میں ردِ عیسائیت پر مفید کتابیں پہلے سے موجود ہیں، یہ متولی یوسف چلپی کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے، وہ جامعہ ازہر کے فاضل اور انڈونیشیا میں تبلیغ اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اس میں مسیحیت کی تاریخ، اصلی دعوت، اس کے فرقوں، اس کی کونسلوں، اصلاحی تحریکوں اور مغرب میں اس کی مذہبی و اخلاقی حالت اور کلیسا کے جبر و تشدد وغیرہ کا ذکر ہے، مصنف نے حضرت مسیحؑ کو خدا کی توحید و عبادت کا داعی اور شریعت موسوی کا متمم بتا کر ثابت کیا ہے کہ تثلیث کا نظریہ فلسفیانہ اور اقانیم ثلاثہ کا تصور کلیسا کی کونسلوں کی پیداوار ہے، جو حضرت مسیحؑ اور اصل انجیل کی تعلیم کے منافی ہے، ان کے نزدیک قرآن مجید ہی عیسائیت کا صحیح ماخذ ہے، کیونکہ خود مسیحی علما کی تصریحات کے مطابق اصل انجیل ناپید ہے، اور اس کے صرف ناقابل اعتبار ترجمے باقی رہ گئے ہیں، جن کے مترجمین تک کا بھی پتہ نہیں، اس سلسلہ میں اناجیل اربعہ اور انجیل برنابا کی زبان اور جمع و تدوین پر گفتگو کر کے واضح کیا ہے کہ انکا حضرت مسیحؑ تو درکنار خود اپنے گمنام مصنفین سے بھی تعلق واضح نہیں، انھوں نے حضرت مسیحؑ کے بعد سے انیسویں صدی تک کلیسا کی منعقدہ کونسلوں کی کارروائیوں کا جائزہ لیکر اصل مسیحیت کو مسخ کرنے کی کوششوں کو بھی نمایاں کیا ہے، اور حضرت مسیحؑ اور عیسائیوں پر رومیوں کے دردانگیز مظالم بھی بیان کیے ہیں، آخر میں عیسائیت، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے بارہ میں قرآنی موقف کی وضاحت ہے، اسی ضمن میں اہل کتاب خصوصاً عیسائیوں سے مسلمانوں کے سیاسی و اجتماعی تعلقات کی نوعیت کا ذکر بھی ہے، لائق مترجم نے رواں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے، مگر زبان کی صحت کا زیادہ لحاظ نہیں کیا ہے، چنانچہ تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے

استعمال میں کافی غلطیاں ہیں جیسے طلب (ص۵۱) صورت (ص۶۰) کتاب (ص۶۶) نام شماری و حکومت (ص۷۵) سند (ص۱۱۲) سفارت (ص۱۲۸) خواہشات (ص۱۳۰-۱۶۶) جماعتوں (ص۳۹) جماعت (ص۱۵۱) مخلوق (ص۱۴۳) شہریت (ص۱۵۹) وغیرہ کو مذکر اور کلیسا (ص۱۱) کو مونث لکھا ہے، اور اختلاف (ص۴۹) حکم (ص۱۷) تضاد (ص۱۱۱) وغیرہ مفرد لفظوں کو جمع استعمال کیا ہے، زبان و بیان کی غلطیوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں، "پادری ابراہیم سعید نے بشارت لوقا کی شرح میں ایسی ہی بے فائدہ ہمت کی ہے، (ص۲۵) تدوین کی زبان اور تاریخ (ص۵۲) ان کی خارق عادت زندگی میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جو بحیثیت ابن اللہ کے ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں"، (ص۲۳) وہ فلسطین کی کوئی بول چال کی زبان رہی ہوگی، (ص۴۹) مسیحؑ نے پاس کی اخیر حالت میں اپنے "باپ" کی طرف نہیں متوجہ ہوئے، (ص۸۸) عیسائیت سے تفصیلی بحث کی اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی، (ص۸) اللہ کے حکم کا نشانہ ہوں (ص۶۹ و ۹۲) کلام مجید کی آیتوں کے ترجمہ میں بھی غلطیاں ہیں، ایک ہی آیت کا ترجمہ کہیں کچھ اور کہیں کچھ اور کر دیا ہے، بعض فقروں کا ترجمہ نہیں کیا ہے، اور بعض جگہ ترجمہ میں بلاضرورت اضافہ کر دئے ہیں، فریقا کذبوا و فریقا یقتلون کا ترجمہ کیا ہے "ان میں سے ایک فریق نے جھٹلایا، اور دوسرے نے قتل و فساد مچایا" (ص۳۰) فریق مفعول تھا، مگر ترجمہ میں اسکو فاعل بنا دیا گیا، قتل و فساد مچانا خلاف محاورہ ہے، یہود نے فساد مچانے ہی پر اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ وہ قتل انبیاء کے بھی مرتکب ہوئے تھے، یہاں اسی کا ذکر ہے، مگر یہ ترجمہ سے واضح نہیں ہو سکا، الذین اتینا ھم الکتاب من قبلہ ہم بہ مومنون کا یہ ترجمہ "جنھیں ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ بھی ایمان لا رہے ہیں" (ص۱۰۳) درست نہیں ہے، "بہ" کا ترجمہ چھوڑ دینے سے

یہ مفہوم ہو گیا کہ اہل کتاب رسول اکرمؐ پر ایمان لا رہے ہیں، جب کہ قرآن کا منشا یہ ہے کہ وہ اپنی اس کتاب پر جو انھیں دی گئی تھی، ایمان لائے ہیں، اسی صفحہ پر انا کنا من قبلہ مسلمین کا یہ ترجمہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جس پر ہم پہلے بھی ایمان لائے تھے"، اسلام و ایمان میں فرق ہے اور قبلہ کی ضمیر کا مرجع حق (قرآن) ہے اس پر پہلے سے ایمان لانے کا کوئی مطلب نہیں بنتا مطلب تو یہ ہے کہ صالحین اہل کتاب اپنے متعلق یہ بتا رہے ہیں کہ ہم قرآن کے آنے سے پہلے ہی سے مسلم (فرماں بردار) تھے، سورہ مائدہ کی ایک آیت میں سماعون کے لفظ کا ترجمہ جاسوسی کرنے والے اور سحت کا سود کیا ہے، اسی طرح قفینا بعیسی الخ کا ترجمہ جانشین بنایا بھی درست نہیں ہے، فلذلک فادع کا ترجمہ "اس لیے آپ دعوت دیجئے" (ص۱۳۰) صحیح نہیں بلکہ اس (دین الٰہی جس کی وصیت انبیائے سابقین کو کی گئی) کی دعوت دیجئے صحیح ہوگا، اشارات اور ضمیروں کے مرجع کی یا تو تعیین نہیں کی ہے، اور اگر کی ہے تو اس میں غلطی ہو گئی ہے، اور عدم تعیین کی وجہ سے بعض جگہ ترجمہ غیر واضح ہے، تمہید میں سورۂ مائدہ کی وہ آیت نقل کی ہے، جس میں یہود کے مقابلہ میں نصاری کو مسلمانوں سے زیادہ قریب بتایا گیا ہے، مگر اس کے سلسلہ میں کوئی وضاحت نہیں کی ہے، ظاہر ہے اس سے عام مسیحی خصوصاً فرنگی قومیں مراد نہیں ہیں، جو پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کے پیرو اور کفارہ و تثلیث کے قائل ہیں، بلکہ حضرت مسیحؑ کے مخلص متبعین مراد ہیں، جو ان کو ابن اللہ کے بجائے خدا کا بندہ اور رسول مانتے تھے، علاوہ ازیں نصاری اور مسیحی مترادف نہیں ہیں، رد عیسائیت کے متعلق کتابوں میں مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم وغیرہ کی کتابوں کا ذکر رہ گیا ہے، ان فروگذاشتوں کی نشاندہی اس لئے کی گئی ہے، تاکہ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے، خامیوں کے باوجود کتاب مفید ہے اور اس سے اردو میں مسیحیت پر ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا"

انوکھے سنسار کی انوکھی باتیں: از جناب بدیع الزماں اعظمی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت: للعہ غیر مجلد ۳؍، پتہ از مصنف ۱۴۰، کرمی ٹولہ، اعظم گڈھ، یو۔ پی،

جناب بدیع الزماں اعظمی ریٹائرڈ ٹیچر ہیں، درس وتدریس کے علاوہ ان کو بچوں کی ذہنی تربیت سے بھی بڑی دلچسپی ہے، اس غرض سے وہ برابر مضامین، ڈرامے اور کتابچے لکھتے رہتے ہیں، انھوں نے اس مصور کتاب میں دنیا کی انوکھی اور دلچسپ باتیں عام فہم زبان میں لکھی ہے، پہلے زمین آسمان، ستاروں، سیاروں، قدیم بری وبحری جانوروں، پرندوں، مکانات، اور رسم ورواج کا دلچسپ ذکر ہو، پھر ہندوستان میں پنج سالہ منصوبوں کے درمیان بنائے گئے باندھ جھیلوں، بجلی گھروں نہروں اور بڑے بڑے کارخانوں کے متعلق مفید معلومات قلمبند کی گئی ہیں، آخر میں آنیوالی اکیسویں صدی کے بارہ میں بعض دلچسپ پیشین گوئیاں ہیں، یہ مفید اور پراز معلومات کتاب سکولوں کے طلبہ کے مطالعہ میں شامل کئے جانے کے لائق ہے،

اجالے از جناب کالیداس گپتا رضا صاحب تقطیع خورد کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۸۰، مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ پتہ دل پبلیکشنز، ۱۰۷ اجولی بھون نمبر۱، انیو مرین لائن چرچ گیٹ بمبئی نمبر۲۰،

جناب کالیداس رضا گپتا مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں، اجالے ان کا نیا مجموعہ کلام ہے، اس میں پہلے نعتیہ کلام اور آخر میں حضرت حسینؓ کی منقبت وشہادت سے متعلق اشعار ہیں، لیکن بعض اشعار غیر موزوں اور کہیں کہیں زبان وانداز بیان عجیب ہے، مثلاً:۔

تھی یہی شانِ محمد کہ رسالت پاکر ساری مخلوق کو قرآن کے جھلائے جھولے ص ۲۱

———— ٭ ————

اے حسینؑ آل نبی، ابن علی، ذبح عظیم عالم شعر سے منظور ہو شاعر کا سلام ص ۵۴

ذبح عظیم کے بجائے صاحب ذبح عظیم اور منظور کے بجائے مقبول کہتے تو کچھ بات بنتی، پھول (ص ۶۶) کو مونث لکھا ہے، قیمت بھی زیادہ ہے، "ض"

جلد ۱۲ ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۷ء عدد ۶

مضامین